ماہنامہ جہد حق

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

HRCP

Monthly JUHD-E-HAQ - December-2019 - Registered No. CPL-13

(قیمت 10 روپے)

جلد نمبر 26.....شمارہ نمبر 12.....دسمبر 2019

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

انسانی حقوق کا عالمی منشور

10 دسمبر 1948ء کو اقوام عالم نے انسانی حقوق کا مندرجہ ذیل عالمی منشور منظور کیا

دفعہ - 1 تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ -2 ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قومیت، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس کے علاوہ کسی بھی شخص کے ساتھ اس کے علاقے یا ملک کی، سیاسی، عملی یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا اقدار اعلی کے لحاظ سے کسی اور بندش کا پابند ہو۔

دفعہ - 3 ہر شخص کو اپنی آزادی، زندگی اور تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 4 کوئی شخص، غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی بھی شکل ہو، ممنوع ہوگی۔

دفعہ - 5 کسی شخص کو جسمانی اذیت، یا ظالمانہ انسانیت سوز، یا ذلت آمیز سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ - 6 ہر شخص کا حق ہے کہ ہر جگہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

دفعہ - 7 قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کی خلاف ورزی میں جو بھی تفریق کی جائے یا جس تفریق کی بھی ترغیب دی جائے، اس سے بچاؤ کے سب برابر کے حقدار ہیں۔

دفعہ - 8 ہر شخص کو ان فعال کے خلاف جو دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کرتے ہوں، بااختیار قومی عدالتوں سے موثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا حق ہے۔

دفعہ - 9 کسی شخص کو من مانے طور پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 10 ہر شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق وفرائض کے تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے فیصلے کے بارے میں اسے ایک آزاد اور غیر جانب دار عدالت میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا موقع ملے۔

دفعہ - 11 (1) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری الزام عاید کیا جائے، اس وقت تک بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے جب تک کہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع اور تمام ضمانتیں نہ دی جا سکی ہوں۔

(2) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بناء پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو جرم کے ارتکاب کے وقت کی مقرر کردہ سزا سے زائد ہو۔

دفعہ - 12 کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط وکتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کو ایسے حملے یا مداخلت سے قانونی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 13 (1) ہر شخص کو اپنی ریاست کی حدود کے اندر نقل وحرکت کرنے اور کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے اپنے ملک میں واپس آ جانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ - 14 (1) ہر شخص کو عقیدے کی بنا پر ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(2) یہ حق ان عدالتی کارروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں کیا جا سکتا جو خالصتا غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف ہیں۔

دفعہ - 15 (1) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(2) کوئی شخص محض من مانے طور پر قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو اپنی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے گا۔

دفعہ - 16 (1) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت، یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(2) نکاح فریقین کی پوری آزادی اور رضامندی سے ہوگا۔

(3) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حقدار ہے۔

دفعہ - 17 (1) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 18 ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتماعی یا انفرادی طور پر خاموشی یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل، اور اس کی عبادات اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ - 19 ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اور بلا کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہے اور جس ذریعے سے چاہے اور ملکی سرحدوں کے حائل ہوئے بغیر معلومات اور خیالات کا حصول اور ان کی ترسیل کرے۔

دفعہ - 20 (1) ہر شخص کو پرامن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ - 21 (1) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

(3) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مماثل کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ - 22 معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو عملاً حاصل کرے، جو اس کی عزت اور شخصیت کی آزادانہ نشوونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ - 23 (1) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب ومعقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(3) ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب ومعقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جا سکے۔

(4) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں، (ٹریڈ یونین) قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ - 24 ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے، جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ وقفوں پر تعطیلات میں شامل ہیں۔

دفعہ - 25 (1) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت اور فلاح وبہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات، اور بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہء قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہے۔

(2) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی کے بغیر پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ - 26 (1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلی تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشوونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(3) والدین کو اس بات کے تصفیہ کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ - 27 (1) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(2) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، فنی یا ادبی تصنیف سے، جس کا وہ مصنف ہے، حاصل ہوتے ہیں

دفعہ - 28 ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہو سکیں جو اس اعلان میں شامل ہیں۔

دفعہ - 29 (1) ہر شخص پر معاشرے کے حق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشوونما ممکن ہے۔

(2) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے اور ایک جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح وبہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔

(3) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ - 30 اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جا سکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی نفی ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

فہرست

پریس ریلیزیں 03

موت کی کال کوٹھڑی میں گزرے روز وشب 04

کیا سرفروشی کی تمنا کا نعرہ لگانے والی لڑکیاں ہی تبدیلی لائیں گی؟ 11

ہم کیا کریں گے؟ 12

بنیادی آزادیوں کے تحفظ کے لیے سوچ بچار 13

سندھ: تعلیمی نصاب میں خواتین کا کردار گھر کے کام کاج تک محدود 15

لاپتہ افراد کا ریکارڈ مرتب کرنے والا خود لاپتہ 16

''انجمن سازی کی آزادی پر اعلانیہ وغیر اعلانیہ پابندیاں ہیں'' 17

مسیحی آبادی کو ان کے گرجا میں عبادت کی اجازت نہیں 19

عزت مآب چیف جسٹس آف پاکستان سے اپیل 21

مسیحی برادری کا مخصوص قبرستان کے لئے مظاہرہ 22

حکومت طلبہ یکجہتی مارچ کی راہ میں رکاوٹیں حائل نہ کرے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کا کہنا ہے کہ حکومتِ پاکستان ملک کے مختلف شہروں اور قصبوں میں بروز جمعہ 29 نومبر کو ہونے والے طلبہ یک جہتی مارچ پر افسوسناک ردِعمل کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

ایچ آر سی پی کو ایسی اطلاعات پر تشویش ہے کہ مارچ کی حمایت کرنے والے طالبعلموں کو ہراساں کیا جا رہا ہے، یونیورسٹی سے یا ان کے ہوسٹلوں سے نکالا جا رہا ہے تا کہ انہیں مارچ میں شامل ہونے سے روکا جا سکے۔ یہ ان کے حقِ اجتماع کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ اس کے علاوہ، مارچ کے حامیوں کی کردار سازی کے لیے سوشل میڈیا پر ہونے والا پراپیگنڈہ نہ صرف گھناؤنا ہے بلکہ یہ انہیں نقصان سے بھی دوچار کر سکتا ہے۔

ایچ آر سی پی کو یہ جان کر بھی افسوس ہوا ہے کہ کوئٹہ میں گورنر سیکریٹریٹ نے جامعہ بلوچستان کو ایک نوٹیفکیشن جاری کیا ہے جس میں ہر قسم کی سیاسی سرگرمی اور اجتماعات پر پابندی عائد کی گئی ہے اور سیکیورٹی کے عملے کو ایسی سرگرمیوں کو روکنے کا واضح اختیار دیا گیا ہے۔

ایچ آر سی پی نے حکومت سے طلبہ یکجہتی مارچ کے مطالبات کو سنجیدہ لینے کا مطالبہ کیا ہے۔ طالبعلموں کو فیسوں میں اضافے اور اعلیٰ تعلیم کے بجٹ میں کٹوتی کے خلاف احتجاج کرنے اور تعلیمی اداروں میں سیکیورٹی فورسز کی غیر ضروری مداخلت کے خاتمے، ہراسانی کے خلاف فعال کمیٹیوں کی تشکیل جس میں طلباء کی نمائندگی بھی ہو اور سب سے بڑھ کر، طلباء یونینوں کی بحالی کا مطالبہ کرنے کا حق ہے۔ ایچ آر سی پی بروز جمعہ ملک بھر میں یک جہتی مارچ میں حصہ لینے والے طالبعلموں کے ساتھ کھڑا ہے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 27 نومبر 2019]

ادریس خٹک کا اغواء جبری گمشدگی کا واقعہ معلوم ہوتا ہے

انسانی حقوق کے دفاع کار اور سیاسی کارکن ادریس خٹک کو صوابی میں نامعلوم افراد کے ہاتھوں اغواء ہوئے ایک ہفتہ بیت چکا ہے۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کے پاس یہ یقین کرنے کی ٹھوس وجہ ہے کہ یہ اغواء جبری گمشدگی کا واقعہ معلوم ہوتا ہے خاص طور پر جب اُن کے اہلِ خانہ کا کہنا ہے کہ اغواء برائے تاوان کے شواہد نہیں ملے۔

محترم خٹک نے ایمنسٹی انٹرنیشنل سمیت انسانی حقوق کے کئی معروف اداروں کے ساتھ کام کیا ہے، نیشنل پارٹی کے ساتھ وابستہ ہیں اور اپنے ترقی پسند سیاسی خیالات کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ اگر انہیں کسی قسم کے الزامات کے تحت حراست میں لیا گیا ہے تو پھر اُن الزامات ثابت کرنے کے لیے باقاعدہ قانونی طریقہ کار اختیار کیا جائے۔

اِس واقعے پر ریاست کی خاموشی لمحہ فکریہ ہے کیونکہ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جبری گمشدگیوں اور من مانی حراستوں کے سنگین مسئلے سے ریاست لاتعلق ہے اور اسے باضابطہ قانونی کارروائی کا کچھ لحاظ نہیں۔

ایچ آر سی پی کا پولیس سے مطالبہ ہے کہ وہ محترم خٹک کا اتہ پتہ معلوم کرنے کے لیے اُن کے اہل خانہ سے مکمل تعاون کرے اور ریاست سے مطالبہ ہے کہ وہ اس واقعے کا سنجیدہ نوٹس لے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 20 نومبر 2019]

صحافیوں کے فورم پر این پی سی کی پابندی قابلِ مذمت ہے

ایچ آر سی پی کو یہ جان کر بہت تکلیف پہنچی ہے کہ بروز ہفتہ 23 نومبر کو نیشنل پریس کلب (این پی سی) کی انتظامیہ نے سینئر صحافیوں کو پریس کلب میں داخل نہیں ہونے دیا۔ این پی سی کی لائبریری میں ہر ہفتے سینئر صحافیوں کا ایک فورم منعقد ہوتا ہے جس کی صدارت محمد ضیاء الدین کرتے ہیں جو کہ اعلیٰ پیشہ ورانہ اخلاقیات اور وقار کے اعتبار سے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ فورم ملکی و عالمی ماہرین اور ہر سیاسی پس منظر کے سیاستدانوں بشمول اُن کے جو حکمران اتحاد سے تعلق رکھتے ہیں، کو مدعو کرتا ہے کہ وہ پاکستان کی معیشت، سماج اور سیاست کے معاملات پر تبادلہ خیال کریں۔

23 نومبر کو پشتون تحفظ موومنٹ (پی ٹی ایم) کے رہنماء منظور پشتین کو مدعو کیا گیا۔ البتہ، این پی سی کی انتظامیہ نے نہ تو پی ٹی ایم کے اراکین اور نہ ہی صحافیوں کو پریس کلب کی حدود میں داخل ہونے دیا اور ایم ضیاء الدین، شاہد الرحمان، مظہر عارف اور جمیل احمد سمیت کئی ممتاز صحافیوں کی ہتک کی۔

ایچ آر سی پی کے خیال میں، این پی سی نے اپنے اِس عمل کے ذریعے آزادیِ اظہار کی سنگین خلاف ورزی اور بُزدلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فورم جو کہ ہر ایک کے لیے ایک کھلی تقریب نہیں تھی، کو اُس وقت دنیا بھر میں اور زیادہ شہرت ملی جب اسے ایک متبادل جگہ — قریب واقع بچوں کے ایک پارک میں منعقد کیا گیا۔ پولیس اور سادہ کپڑوں میں ملبوس افراد کی بھاری تعداد میں موجودگی صحافیوں کو یہ فورم منعقد کرنے سے خوفزدہ نہ کر سکی۔ ایچ آر سی پی اُن کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کرتا ہے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 25 نومبر 2019]

موت کی کال کوٹھڑی میں گزرے روز وشب

جسٹس پراجیکٹ پاکستان (جے پی پی) کی رپورٹ پاکستان میں سزائے موت: ایک تنقیدی جائزہ (The Death Penality In Pakistan: A Critical) کے ایک باب کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے جو سزائے موت کے ان قیدیوں کی دلخراش داستانوں پر مشتمل ہے جو کئی برس جیل کی کال کوٹھڑی میں پابند سلاسل رہے اور ریاست کے فرسودہ نظامِ انصاف کا نشانہ بنتے رہے۔

صفیر

میں 1979 میں ایک محبت بھرے گھرانے میں پیدا ہوا۔ میرا بچپن بہت خوشگوار تھا۔ میرے پانچ بھائی بہنیں ہیں۔ میرے والد پھلوں کا کاروبار کرتے تھے۔ وہ باغ ٹھیکے پر لیتے اور اس میں سے پھل اتار کر بیچتے تھے۔ ہم انتہائی عاجز زندگی بسر کررہے تھے۔ ہمارے پاس ضروریات زندگی کی سب چیزیں تھیں۔ مجھے فٹبال کھیلنے کا بہت شوق تھا اور میں اب بھی ٹی وی پر میچ دیکھتا ہوں۔ میری بچگانہ عادتوں کی وجہ سے میری ماں مجھے بھولا (پنجابی: معصوم) کہتی تھی۔ اسکول میں میری کارکردگی اچھی تھی اور میرے والدین مجھے اور اچھا پڑھنے لکھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ میں نے 1993 میں اسکول چھوڑ دیا کیونکہ میں اپنی پڑھائی جاری نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد میں نے کاروں کی مرمت کی ورکشاپ میں کام کرنا شروع کردیا۔

18 جولائی 2001 ایک اور معمول کا دن تھا جس دن قتل ہوا۔ مجھے اس بدقسمت دن کے متعلق تفصیلات کا آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ میرا جرم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ اس کا محرک کیا تھا مگر مجھے اتنا پتہ ہے کہ وہ قتل ایک جھگڑے کے نتیجے میں ہوا تھا۔

مجھے مقدمے میں ملوث کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ملزم تنویر میرا دوست تھا۔ تنویر نے پولیس کو بتایا کہ میں قتل میں ملوث تھا۔ کل پانچ لوگوں پر مقدمہ درج ہوا تھا جن میں تنویر، میں، مقتول کی بیوی کائنات، خالد اور جنید شامل ہیں۔ ہم پر کائنات کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کرنے اور اس کے خاوند کو قتل کرنے کا الزام تھا۔ مجھے مقدمے میں اس لیے ملوث کیا گیا تاکہ دوسرے ملزمان قتل کا ذمہ دار مجھے ٹھہرا سکیں۔ چنانچہ ان میں سے میں ہی ہوں جس کے خلاف تحقیقات کی گئیں اور جس پر تشدد کیا گیا۔

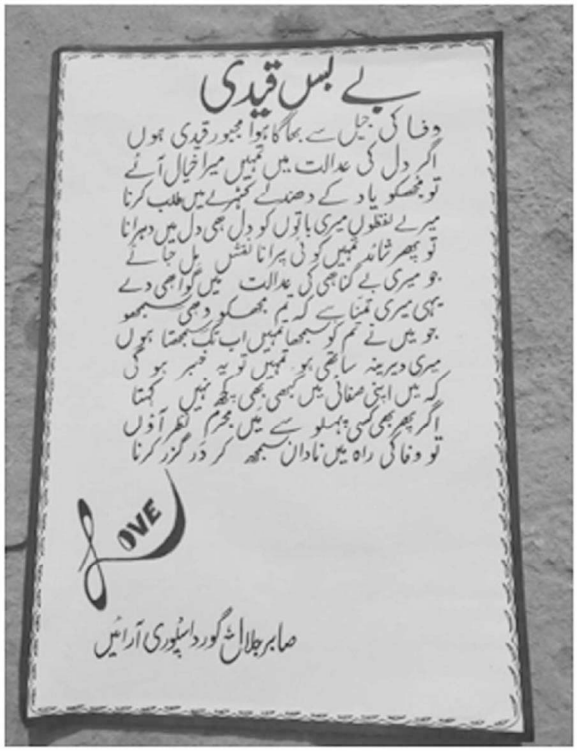

وقوعے کے دو دن بعد، پولیس نے میرے گھر پر چھاپہ مارا۔ میں ایک معصوم شخص ہوں جس نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی۔ میں ڈر گیا تھا۔ میں ایک رشتہ دار کے گھر بھاگ گیا مگر وہاں سے گرفتار ہوگیا۔ میں دو دن تک ان کی تحویل میں رہا جس دوران مجھے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ پولیس چاہتی تھی کہ میں قتل کا اعتراف کروں مگر میں نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ انہوں نے مزید جسمانی ریمانڈ نہ لیا کیونکہ میری گرفتاری سے قبل نعش برآمد ہوگئی تھی اور انہوں نے رسمی کاروائیاں مکمل کرلی تھیں۔

میرے ٹرائل کے دوران ہر کوئی میرے بارے میں فکرمند تھا؛ میں بھی پریشان تھا۔ پہلے مجھے ہتھکڑیاں لگا کر عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہ ایک خوفناک تجربہ تھا۔ میرے اہل خانہ نے پہلی بار مجھے ہتھکڑیوں میں دیکھا تھا۔ ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی کیونکہ میں انہیں بہت زیادہ یاد کرتا تھا مگر حالات کی وجہ سے وہ ملاقات ہولناک بھی لگ رہی تھی۔ وہاں بہت سے لوگ تھے اور جس طریقے سے مجھے پیش گیا گیا اس سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مجھے دیکھ رہے تھے اور میرے خاندان کے بارے میں کوئی رائے قائم کررہے تھے۔ ہمارے رشتہ دار بھی وہاں تھے جو میرے لیے ہزیمت کا سبب تھا۔

جرم وقوع پذیر ہونے کے وقت میں گھر پر تھا اور میرے وکیل نے عدالت میں یہ نقطہ اٹھایا تھا مگر جج نے اس حقیقت پر غور نہ کیا۔ میرے والد نے میرے لیے وکیل کی خدمات لی تھی۔ میرے وکیل نے بہت کمال کے ساتھ میرا مقدمہ لڑا اور وہ پرامید تھا کہ مجھے بری کردیا جائے گا۔ تاہم، مدعی فریق نے جج کو اپروچ کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میرے خلاف مقدمہ کمزور تھا۔ ٹرائل کے دوران میری معصومیت کا نقطہ بھی اٹھایا گیا۔ ایس ایچ او نے عدالت میں جھوٹ بولتے ہوئے کہا کہ مجھے جائے واردات سے گرفتار کیا گیا تھا اور اس وقت میں ایک ڈنڈے سے مسلح تھا۔ جج نے جھوٹے بیان پر اس کی سرزنش کی۔ ٹرائل کے دوران کسی نے بھی میرے خلاف گواہی نہ دی۔ کائنات کی گرفتاری کے تین ماہ بعد اسے ضمانت پر رہا کردیا گیا۔

میری درخواست ضمانت مسترد ہوگئی مگر جج نے مجھے حوصلہ دیا کہ میں فیصلے کے خلاف اپیل کروں۔ بعد میں، اس نے مجھے اپیل نہ کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ مدعی فریق نے اپیل کورٹ میں ایک جج کو اپروچ کیا تھا۔ اس لیے میں نے اپیل نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مقتول والا ایک طاقتور آدمی تھا۔ وہ ایک زمیندار تھا۔ ٹرائل اڑھائی برس جاری رہا۔ مجھے اور ایک دوسرے ملزم کو سزائے موت سنائی گئی اور باقی دو کو عمر قید سنائی گئی۔

فیصلہ سن کر میں بہت زیادہ افسردہ ہوگیا۔ فیصلے کے وقت میری والدہ وہاں تھی مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آئی تھی کہ کیا کہا جارہا تھا۔ جب وہ گھر پہنچی اور کسی نے اسے بتایا تو پھر ہی اسے پتہ چلا۔ وہ چیخنا شروع ہوگئی۔

جب میں جیل میں تھا تو مجھے پتہ چلا کہ یہاں وقت ضائع ہوگا چنانچہ مجھے خیال آیا کہ یہاں میں کوئی کام بھی کرسکتا ہوں۔ اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اپنی اصلاح کرنی اور اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔ پہلے پہل میں نے قرآن پڑھنا سیکھا اور ترجمہ تفسیر (اردو ترجمہ اور تشریح) مکمل کی۔ پھر میں نے اپنی رسمی تعلیم مکمل کی۔ میں نے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ

مکمل کیا۔ پھر میں نے اپنی انڈر گریجوایٹ ڈگری مکمل کی اور اسلامیات میں ماسٹرز کی ڈگری شروع کی۔ مجھے امید ہے کہ میں جلد ہی اپنا ماسٹرز مکمل کرلوں گا۔ میں نے خود ہی خطاطی سیکھی اور ابھی تک اس کی پریکٹس کرتا ہوں۔ میں نے شاعری لکھنا بھی شروع کیا۔ ان مشغلوں نے مجھے کسی حد تک سہارا اور امید دی۔

جیل میں، میں نے کبھی اپنے آپ کو جذبات کے تابع نہ ہونے دیا۔ جیل میں سزائے موت کی کوٹھری میں زندہ رہنے کے لیے مجھے پتھر کا دل چاہیے تھا۔ سزائے موت کا قیدی بننے کے بعد مجھے حقیقی معنوں میں موت کا تصور سمجھ میں آیا۔ قید کے دوران میں نے بہت زیادہ پھانسیوں کا مشاہدہ کیا؛ میرے خیال میں 50 پھانسیاں ہوں گی۔ موت کی سزا آپ کو تبدیل کر دیتی ہے۔

موت کی کوٹھری میں، میں پانچ وقت کی نماز پڑھتا تھا۔ جیسے ہی مجھے پتہ چلا کہ مجھے یہاں بہت زیادہ عرصہ گزارنا پڑے گا تو مجھے سمجھ آئی کہ مجھے صابر بننا پڑے گا۔ میں وقت پر کھانا کھاتا تھا۔ میں واک پہ بھی جاتا تھا۔ مگر مجھے صرف موت کی کوٹھڑیوں کے بلاک میں واک کرنے کی اجازت تھی۔ بلاک کا رقبہ تقریباً 40 فٹ تھا۔ مجھے دن کے 22 گھنٹے موت کی کوٹھڑی میں گزارنا پڑتے تھے۔ موت کی کوٹھڑیوں کا سائز بہت چھوٹا ہوتا ہے۔

جب میں جیل میں تھا تو اس دوران دو فسادات ہوئے۔ پہلا فساد 2001 میں ہوا جب میں سماعت پر عدالت میں تھا۔ جیل میں ناانصافی کی وجہ سے بغاوت ہوئی تھی؛ جیل کے محافظ قیدیوں سے خوراک اور پیسہ چھین لیتے تھے۔ اس کی وجہ سے قیدیوں نے گروپ بنائے جس کے نتیجے میں جیل میں بغاوت برپا ہوئی۔

ایک قیدی بشیر پر سرکشی کے الزام میں تشدد کیا گیا جس سے اس کی المناک موت واقع ہوگئی۔ بشیر کی موت سے بغاوت زیادہ شدید ہوگئی۔ قیدیوں نے جیل کے تالے توڑنا شروع کردیے جس کے بعد جیل کے محافظوں نے لاٹھی (اردو: ڈنڈا، چھڑی) چارج کیا جس کے نتیجے میں اور قیدی ہلاک ہوئے۔ صورتحال بہت نازک ہوگئی تھی اور جیل انتظامیہ کو مداخلت کرنا پڑی۔ جیل انتظامیہ اور قیدیوں کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا۔ قیدیوں نے ایک حلف نامہ دیا۔ جیل کے چند محافظ ملازمت سے برخاست کردیے گئے جس سے محافظ غصے میں آ گئے۔ چنانچہ رات کے وقت وہ لاک اپ کھولتے اور بیرکوں سے ایک فرد کو نکالتے اور لاٹھی کے ساتھ اسے پیٹتے۔ انہوں نے قیدیوں کی ٹوٹتی ہڈیوں اور دیگر زخموں کی کوئی پرواہ نہ کی۔

شریک ملزم جنید کے ساتھ میری تاریخ بہت کٹھن رہی ہے۔ جب وہ ضمانت پر رہا ہوا تو اس کا بھائی میرے بھائی کے پاس گیا اور میری درخواست ضمانت دائر کرنے کے لیے اس سے 400,000 روپے طلب کیے۔ مگر میرے بھائی نے صاف انکار کردیا۔ جنید مجھے جیل کے جرائم میں پھنسوانے کی حتی الامکان کوشش کرتا رہا۔ اس نے سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کہ میں نے 10,000 روپے بطور رشوت طلب کیے تھے۔

میں جیل میں مذہبی ٹیچر بن گیا چنانچہ مجھے استاد کہا جانے لگا۔ جلد ہی میں نے جیل میں منشی کے طور پر کام کرنا شروع کردیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے ہاتھ کی لکھائی صاف تھی۔ منشی کے طور پر مجھ پر اعتبار بھی کیا جاتا تھا کیونکہ میں بدعنوان نہیں تھا۔ میں آسانی کے ساتھ **5000** سے زائد روپے لے سکتا تھا۔ بدعنوان نہ ہونے کی وجہ سے جیل کا عملہ اور دیگر قیدی میری عزت کرتے تھے۔ میرے خاندان کو بھی اس لیے مجھ پر فخر تھا۔ وہ سردی کے موسم میں دوسرے قیدیوں کے لیے کمبل بھیجتے تھے۔

مگر سپرنٹنڈنٹ نے اس پر یقین نہ کیا اور یہ کہتے ہوئے میرا دفاع کیا کہ جنید ایک ایسے فرد کی شکایت کررہا ہے جو رشوت کے طور پر کسی سے پانی تک نہیں لے سکتا۔ اس قسم کا اضافی دباؤ اور ہراسانی مجھے غصہ دلاتی تھی مگر میں جانتا تھا کہ میں اس پر کچھ نہیں کرسکتا اور مجھے صرف برداشت کرنا پڑتا تھا۔

ایک اور شریک ملزم خاور دوران حراست وفات پا گیا۔ اسے موسم سرما میں دل کا دورہ پڑا تھا۔ جیل کی غفلت اور اس کے علاج میں ناکامی کا بھی اس کی موت میں ہاتھ تھا۔ حراست کے دوران مجھے ہیپاٹائٹس ہوگیا مگر شکر ہے کہ میں صحت یاب ہوگیا۔

میں جیل میں مذہبی ٹیچر بن گیا چنانچہ مجھے استاد کہا جانے لگا۔ جلد ہی میں نے جیل میں منشی کے طور پر کام کرنا شروع کردیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے ہاتھ کی لکھائی صاف تھی۔ منشی کے طور پر مجھ پر اعتبار بھی کیا جاتا تھا کیونکہ میں بدعنوان نہیں تھا۔ میں آسانی کے ساتھ 5000 سے زائد روپے لے سکتا تھا۔ بدعنوان نہ ہونے کی وجہ سے جیل کا عملہ اور دیگر قیدی میری عزت کرتے تھے۔ میرے خاندان کو بھی اس لیے مجھ پر فخر تھا۔ وہ سردی کے موسم میں دوسرے قیدیوں کے لیے کمبل بھیجتے تھے۔

عدالت عالیہ میں میرا مقدمہ پہنچنے تک میں موت کی کوٹھڑی میں ساڑھے چھ برس گزار چکا تھا اور میں نے حراست میں کل ساڑھے آٹھ برس گزارے تھے۔ عدالت عالیہ نے میری سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کردیا۔ میں جانتا تھا کہ میں بے قصور ہوں اور اپنی جدوجہد کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے عدالت عظمیٰ میں اپیل دائر کی۔ چونکہ اب میں جیل سے باہر ہوں مجھے اس چیز کی امید نہیں ہے کہ میرا مقدمہ جلد سنا جائے گا۔ اب تک کی صورتحال یہ ہے کہ عدالت میں میری اپیل کو پڑے نو برس ہوچکے ہیں۔ میں نے سزا کی معطلی اور ضمانت کے لیے درخواست دائر کی اور چونکہ مقدمہ کے شریک ملزم کو ضمانت مل چکی تھی اس لیے مجھے بھی دے دی گئی۔

جس دن میری ضمانت ہوئی، اس دن میرے بھائی نے مجھے اس سے مطلع کرنے کے لیے فون کیا۔ میں نے اسے 60 آدمیوں کے لیے کھانا لانے کو کہا۔ میں جیل میں اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی رہائی کی خوشی منانا چاہتا تھا۔ یہ خبر سن کر میں اتنا زیادہ خوش ہوا کہ مجھے لگا کہ میں زمین سے دو فٹ اوپر ہوا میں اڑ رہا ہوں۔ میری رہائی کا سن کر جیل انتظامیہ نے میری جلد از جلد رہائی کا حکم صادر کیا۔ جیل انتظامیہ سمیت ہر کوئی میرے لیے خوش تھا۔ انہوں نے لاؤڈ اسپیکر پر میری رہائی کا اعلان کیا اور حکم دیا کہ مجھے کسی سے بھی ملنے سے روکا نہ جائے۔

کئی قیدیوں اور جیل کے اہلکاروں نے میرا استقبال کیا۔ سب مجھے الوداع کہنے کے لیے مرکزی دروازے پر آئے۔ قواعد کی رو سے مرکزی دروازہ صرف بڑے درجے کے افسران کے لیے کھلتا ہے۔ تاہم، انہوں نے جیل میں میرے اچھے رویے کی وجہ سے مجھے اس ضابطے سے استثنیٰ دیا۔ یہاں تک کہ جیل سپرنٹنڈنٹ مجھے مبارکباد دینے کے لیے آئے۔ میں نے 18 برس جیل میں گزارے تھے۔ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ حراست کے پورے دورانیے میں، میں واحد قیدی تھا جس نے کبھی کسی ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کی۔

جب میں جیل سے باہر نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ باہر کی ہوا مختلف تھی۔ میں جیل میں کبھی کہے بغیر کوئی کام نہیں کرسکتا تھا۔ جب بھی مجھے کوئی کام کرنے کا حکم ہوا، مجھے اس کی پاسداری کرنا پڑتی تھی۔ اب اپنی ذات کے مالک ہونے، اپنی زندگی پر کنٹرول ہونے کی آزادی بہت زیادہ ہے۔ جب میں باہر آیا تو میرا بھائی میرے استقبال کے لیے اور مجھے گھر لے جانے کے لیے کھڑا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں گھر کب پہنچا۔ گھر پر رشتہ داروں کا ایک ہجوم تھا جو مجھے دیکھ کر خوشی سے چیخ رہے تھے، میری رہائی پر مجھے مبارکباد دے رہے تھے۔

میں بیان نہیں کرسکتا کہ زندگی اب کیسی محسوس ہوتی ہے۔ یہ جان کر کہ میں جو چاہوں اور جب چاہوں کرسکتا ہو۔

چھوٹی چیزیں ہی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ میں فرش پر سوتا تھا اوراب مین چارپائی پہ سوتا ہوں۔ میں آرام دہ نیند سونے اور ریشمی کپڑے کے نیچے گرم رہنے کے لیے موسم سرما کا انتظار نہیں کرسکتا۔ یہ ایسا احساس ہے جو مجھے اپنی قید کے بعد سے نہیں ہوا۔

زندگی کی تعمیر نو مشکل کام ہے۔ میرے اردگرد زیادہ تر لوگ مجھ سے خوفزدہ ہیں کیونکہ میں قتل کے مقدمے میں جیل میں تھا۔ وہ نہیں سمجھتے کہ میں کن مراحل سے گزرا یا کیا کچھ ہوا تھا۔ انہیں ابھی تک یقین ہے کہ میں ایک قاتل ہوں۔ البتہ، جب واقعہ پیش آیا تو گاؤں کا ہرفرد میرا حمایتی تھا۔ مدعی فریقین نے میرے متعلق اور میرے کردار کے بارے میں جاننے کے لیے گاؤں کا دورہ بھی کیا تھا۔ انہیں ہرایک نے انہیں بتایا کہ میں نے جرم نہیں کیا تھا اور جنید کی وجہ سے مجھ پر غلط الزام لگایا گیا ہے۔

اس پورے مقدمے نے میری زندگی تباہ کردی ہے۔ میں نے 18 برس جیل میں گزارے ہیں۔ جیل نے مجھ سے میری زندگی کے بہترین برس لے لیے۔ مجھے اپنی زندگی دوبارہ تعمیر کرنا پڑی اور یہ کام بہت مشکل ہے۔ میں بہت زیادہ غصے میں تھا۔ میں ان لوگوں سے بدلہ لینا چاہتا تھا جنہوں نے میرے ساتھ زیادتی کی تھی۔ میرے والد اوردوسرے قریبی رشتہ دارفوت ہوگئے جب میں جیل میں تھا۔ مگر میرے بھائی نے میرا حوصلہ بڑھایا اور میں نے وعدہ کیا کہ جو کچھ بھی ہو چکا ہے میں اس میں سلامتی تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں شادی کرنا چاہتا ہوں مگر ایسا کرنے کے لیے مجھے اپنے گھر کو بڑا کرنا ہوگا۔ شادی کے بارے میں سوچنے سے پہلے مجھے کوئی ملازمت بھی ڈھونڈنی پڑے گی۔ میرے جیل کے پس منظر کی وجہ سے میرے لیے ملازمت کے امکانات روشن نہیں ہیں۔

ہمارے قانونی نظام کو تبدیل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک آدمی نے ایک جرم کیا ہے تو اسے 50 مقدمات میں ملوث کیا جائے گا۔ جیل میں میں ایک آدمی سے ملا جس کا جائیداد کا تنازعہ تھا مگر مولوی کی مدد سے اسے مذہب کی توہین کے مقدمے میں پھنسوایا گیا تاکہ اصل مسئلے سے توجہ ہٹ جائے۔ میں نے محسوس کیا کہ جیل میں 99 فیصد لوگ بے قصور تھے۔ میرے خیال میں بے قصور لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے جیل میں ہونے کی ذمہ دار پولیس ہے کیونکہ وہ مقدمات کی اچھی طرح تحقیقات نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پولیس متاثر فرد کی سنائی گئی کہانی پر کوئی اعتراض نہیں اٹھاتا اور جس پر بھی متاثرہ فرد الزام عائد کرے اسے گرفتار کر لیتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ معاملے کی مکمل تحقیقات کریں۔ بعد میں یہ مسئلہ بن جاتا ہے کیونکہ جج سزا سناتے وقت غلط تحقیقات پر انحصار کرتے ہیں۔

نظام تبدیل کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کی بدولت بے قصور لوگ لمبے عرصے تک جیل میں گلتے سڑتے رہتے ہیں۔ یہ نظام لوگوں کی زندگیاں تباہ کر رہا ہے۔

ذیشان

میرا تعلق فیصل آباد کے نزدیک تاندلیانوالہ نامی ایک چھوٹے سے شہر سے ہے۔ دو بھائیوں اور پانچ بہنوں کے ساتھ میری پرورش ہوئی۔ میرے والد کا بھائی بھی ہمارے ساتھ رہتا تھا۔ ان کا کوئی بچہ نہیں تھا۔

میرا والد اپنی زمین پر کاشتکاری کرتا تھا۔ میرے والدین ہمیں اسکول بھیجتے تھے مگر ہم کلاسز چھوڑ دیتے اور گھومنے پھرنے میں دن گزار دیتے تھے۔ میں تیسری جماعت تک پڑھتا رہا مگر اس کے بعد کوئی پیش رفت نہ کرسکا۔ میری کارکردگی اچھی تھی اور ریاضی اور اردو سیکھا۔ سکول سے نکلنے کے بعد میں نے کپڑوں کی سلائی سیکھی۔ اور 1988 میں ایک جنرل اسٹور کھولا جب میں 14 برس کا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد، میرا چھوٹا بھائی بھی میرے ساتھ اسٹور چلانے لگ گیا۔

اس تاریخی دن، 10 مارچ 2002 کو، میرا بھائی سورج غروب ہونے کے وقت دکان پر تھا۔ میں ایک شادی میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ میرے بھائی نے ایک لڑکے سے 300 پاکستانی روپے (کوئی 4 یو ایس ڈی) لینے تھے۔ لڑکا رقم مانگنے پر ناراض ہوگیا اور مطالبہ کیا کہ اس سے رقم مانگنے کا سلسلہ بند کیا جائے۔ صورتحال بگڑ گئی اور لڑائی پر منتج ہوئی۔ یہ موبائل فونوں سے پہلے کی بات ہے، چنانچہ لڑکے نے ایک پبلک کال آفس (پی سی او) استعمال کیا اور کسی کو اپنی مدد کے لیے بلایا۔ لڑکے کا چچا دکان پر آیا اور میرے بھائی کو مارنا شروع کردیا۔ عیدالاضحیٰ قریب تھی۔ اس لیے ہم نے اپنے سٹور میں چھریاں بیچنے کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ میرے بھائی نے ایک چھری پکڑی اور اپنے دفاع میں ان پر حملہ کردیا۔ تمام لوگ زخمی ہوگئے۔ تین لوگ تھے جن میں سے دو موقع پر ہلاک ہوگئے۔

میں شادی سے ہوکر اپنی دکان کی طرف جارہا تھا کہ راستے میں مجھے لوگوں نے روکا اور مجھے جلدی سے دکان پر جانے کو کہا۔ میں نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ وہ مجھے ایسا کیوں کہہ رہے ہیں مگر دکان کی طرف بھاگا۔ میں تقریباً ایک کلومیٹر دور تھا کہ میں نے مقامی مسجد سے اعلان سنا کہ کوئی مرگیا ہے۔ میں نے ایک پی سی او سے لمبردار کو فون کیا یہ پوچھنے کے لیے کہ کیا ہوا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے بھائی نے دو لوگوں کو قتل کردیا ہے جبکہ ایک آدمی زخمی ہے۔ ایف آئی آر کے اندراج کے دوران، میں نے مدعی فریق سے درخواست کی کہ وہ مقدمہ صرف ایک آدمی کے خلاف درج کروائیں کیونکہ وقوعے میں صرف ایک آدمی ملوث تھا۔ انہوں نے یہ دلیل سننے سے انکار کردیا۔ اس رات، پولیس ہمارے گھر آئی۔ میرا خاندان اور میں، بچوں سمیت گھر سے بھاگ گئیا ور ہمسائے کے گھر چلے گئے۔

میں شادی سے ہوکر اپنی دکان کی طرف جارہا تھا کہ راستے میں مجھے لوگوں نے روکا اور مجھے جلدی سے دکان پر جانے کو کہا۔ میں نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ وہ مجھے ایسا کیوں کہہ رہے ہیں مگر دکان کی طرف بھاگا۔ میں تقریباً ایک کلومیٹر دور تھا کہ میں نے مقامی مسجد سے اعلان سنا کہ کوئی مرگیا ہے۔ میں نے ایک پی سی او سے لمبردار کو فون کیا یہ پوچھنے کے لیے کہ کیا ہوا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے بھائی نے دو لوگوں کو قتل کردیا ہے جبکہ ایک آدمی زخمی ہے۔ ایف آئی آر کے اندراج کے دوران، میں نے مدعی فریق سے درخواست کی کہ وہ مقدمہ صرف ایک آدمی کے خلاف درج کروائیں کیونکہ وقوعے میں صرف ایک آدمی ملوث تھا۔ انہوں نے یہ دلیل سننے سے انکار کردیا۔ اس رات، پولیس ہمارے گھر آئی۔ میرا خاندان اور میں، بچوں سمیت گھر سے بھاگ گئیا ور ہمسائے کے گھر چلے گئے۔

میرا بھائی تین دن تک گھر کے بالائی حصے میں ٹھہرا رہا۔ میں اپنے بھائی سے رابطے میں رہا۔ واقعے کے تیسرے دن، ہم اپنے بھائی کو مقامی پولیس اسٹیشن لے گئے۔ ایف آئی آر تین افراد کے خلاف درج ہوئی تھی؛ ایک آدمی پر مجرمانہ سازش کا الزام تھا اور مجھ اور میرے بھائی پر قتل کا الزام تھا۔ میرے متعلق کہا گیا کہ میں نے قتل میں سرگرم حصہ لیا اور ایک آدمی کو چھریاں ماریں۔ 20 دن کے بعد، میں نے اپنی بے قصوری ثابت کرنے کے لیے خود کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے روبرو پیش کیا۔ اسی دوران میرے بھائی کو جوڈیشل لاک اپ میں بھیج دیا گیا تھا۔

جب ایف آئی آر درج ہوجائے تو پولیس کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاملے کی مکمل طور پر چھان بین کرے اور حقیقت معلوم کرے، مگر پولیس نے ایک مقدمہ درج کیا اور مقدمے میں شامل ہر ایک پر الزام عائد کیا۔ اگرچہ صرف ان کو تحویل میں لینا چاہیے جنہوں نے جرم کیا ہوتا ہے مگر حقیقت میں پورے خاندان کو معاملے میں گھسیٹا جاتا ہے جس کے باعث

کئی مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔

میں گرفتاری کے بغیر دو سے تین دن تک پولیس کی تحویل میں رہا۔ پھر مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا جس نے پولیس کو 14 دن کا ریمانڈ دیا۔ پولیس نے فرد جرم میں کہا کہ میں بے قصور ہوں۔ پولیس نے فرد جرم میں یہ بھی لکھا کہ یہ ذاتی دفاع کا واقعہ تھا۔ مجھے دوبارہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا اور پھر جوڈیشل لاک اپ میں بھیج دیا گیا۔

میرے والد کی سات ایکڑ زمین تھی۔ میرے برادر نسبتی کو مقدمے کے اخراجات کا بندوبست کرنے کے لیے بہت ہی کم نرخ پر، 155,000 پاکستانی روپے (تب 2583 یو ایس ڈی) فی ایکڑ کے حساب سے وہ ساری اراضی فروخت کرنا پڑی۔ باقی ماندہ رقم قومی بچت سکیم میں جمع کروادی گئی۔

سیشن کورٹ میں ہمارا ٹرائل شروع ہوا اور 16 ماہ میں مکمل ہوا۔ ہمارے وکیل نے ٹرائل کے دوران ذاتی دفاع کا نقطہ اٹھایا تھا۔ مگر مدعی فریق یہ کہہ کر مقدمے پر اثر انداز ہوا کہ وہ اپنے فروخت شدہ دودھ کے پیسے وصول کرنے کے لیے روزانہ کے معمول کے دورے پر تھے، جب ہم نے رقم کے متعلق شور مچایا اور ان پر حملہ کیا۔ ہم نے پولیس کو 15 سے 16 حلف نامے اور بیانات جمع کروائے جن میں جائے وقوعہ پر موجود ایک رکشہ ڈرائیور اور پی سی او آپریٹر کا بیان بھی تھا جن میں بتایا گیا تھا کہ اصل میں ہوا کیا تھا۔ انہوں نے کسی بھی بیان کو توجہ نہ دی۔ مجھے اور میرے بھائی کو سزائے موت سنائی گئی مگر مجرمانہ سازش کے مورد الزام تیسرے شخص کو بری کر دیا گیا۔ ہمیں موت کی کوٹھڑیوں میں بھیج دیا گیا۔

وہ وقت میرے لیے بہت مشکل تھا جب میں سزائے موت سننے کے بعد جیل واپس آیا۔ اپنی قید کے دوران مجھے نیند نہیں آئی۔ مگر جب میں نے موت کی کوٹھڑی اور اس کی حالت دیکھی تو رونا نہ روک سکا۔

لاہور ہائی کورٹ نے چھ برس بعد 2009 میں ہماری اپیل کی سماعت شروع کی۔ یہ وہی وقت تھا جب جنرل پرویز مشرف کے دور میں پی سی او جج کام کر رہے تھے۔ ہم نے ایڈووکیٹ مسٹر بھٹی کو اپنا وکیل نامزد کیا اور اسے 300,000 پاکستانی روپے (تب 3,659 یو ایس ڈی) ادا کیے۔ 27 جولائی 2018 کو عدالت نے فیصلہ سنایا۔ لاہور ہائی کورٹ نے مجھے رہا کر دیا مگر میرے بھائی کی سزا برقرار رکھی۔ ہم نے اپنے بھائی کی سزا کے خلاف عدالت عظمیٰ میں اپیل دائر کی۔ عدالت عظمیٰ میں ابھی تک مقدمے زیر التوا ہیں۔

میں دس برس سے زائد عرصہ تک جیل میں رہا اور اس دوران میں نے کسی کو پریشان کیا نہ مجھے کسی نے پریشان کیا۔ جیل میں رہنا بہت تکلیف دہ تھا۔ میں اپنے خاندان کو بہت زیادہ یاد کرتا تھا۔ مجھے اپنی بیوی اور بچوں کو پیچھے چھوڑنا پڑا تھا۔ میری قید کے دوران میری والدہ وفات پا گئیں۔ جیل میں اتنے زیادہ مچھر تھے کہ ہم رات کو سو نہیں پاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ جیل میں تقریباً 40 فیصد لوگ بے قصور ہیں اور انہیں جیل میں نہیں ہونا چاہیے اور دیگر 60 فیصد صرف اس وجہ سے وہاں ہیں کہ ان کے کسی رشتہ دار یا دوست نے جرم کیا ہے اور انہیں ناجائز طور پر ملوث کیا گیا ہے۔

جب میں جیل میں تھا تو اس دوران پانچ لوگوں کو ایک مقدمے میں پھانسی دی گئی تھی۔ مقدمہ فیصل آباد سے باہر واقع ایک چھوٹے سے گاؤں کا تھا۔ دو افراد مجرم تھے جبکہ باقی تینوں مکمل طور پر بے قصور تھے۔ ان میں سے دو کو اس وقت نوعمر قرار دیا گیا جب جنرل مشرف نے جووینائل جسٹس سسٹم آرڈیننس 2002 متعارف کروایا تھا۔ انہیں ایک برس تک نوعمر تصور کیا گیا، مگر بعد میں مدعی فریق اور یونین کونسل انتظامیہ کی ساز باز سے انہیں بالغ قرار دیا گیا۔ ان کی مدد کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔ ان سب کو 2005 میں پھانسی دے دی گئی۔

فوجداری نظام انصاف میں اصلاح کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ بے قصور لوگوں کو رہائی جبکہ حقیقی مجرموں کو سزا ملنی چاہیے۔ جعلی مقدموں کے اندراج پر پابندی ہونی چاہیے اور رشوت کا خاتمہ ہونا چاہیے۔

ہمیں مدعی فریق کے ساتھ مصالحت کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ ہم نے انہیں بطور دیت پچاس لاکھ پاکستانی روپے کی پیشکش کی اور معاملے کو حل کرنے کی بہت زیادہ کوشش کی۔

جیل سے رہائی کے بعد میں لاہور میں رہا تاکہ اپنے برادر نسبتی کی جائیداد سنبھال سکوں جو جنوبی افریقہ میں رہتا ہے۔ میں لاہور میں صرف چھ ماہ رہا اور پھر واپس گاؤں جانا پڑا تاکہ مصالحت کے لیے انتظامات کر سکوں۔

میں دشمنی کے باعث مدعی فریق کے گھر نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے یہ کام کرنے کے لیے ایک رکن پارلیمان کی طرح کی نمایاں شخصیت چاہیے تھی۔ ریاض فتیانہ اور چوہدری محمد سرور مدعی فریق کے پاس گئے اور انہیں صلح کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ مرنے والے کے بھائی سے بھی بہت مرتبہ رجوع کر کے پیشکش قبول کرنے کی درخواست کی گئی۔ انہوں نے ہماری پیشکشوں کو رد کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ حالاں کہ ہمارے درمیان اب کوئی دشمنی نہیں۔ وہ واحد وقوعہ تھا اور اچانک پیش آیا تھا۔

میری زندگی کا مقصد ہے کہ میں اپنے اردگرد رہنے والے لوگوں کی زندگیاں بہتر کرنے کے لیے جو کچھ کر سکتا ہوں کروں، اب زیادہ کوشش کروں کیونکہ اب میں جیل سے باہر ہوں۔ معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے میں تین بار ضلع کونسل کا رکن منتخب ہوا ہوں۔ پہلی بار مشرف کے دور میں 2001 میں منتخب ہوا تھا۔ میں حال ہی میں دوبارہ منتخب ہوا تھا۔ میں دوسروں کے مسائل حل کرنے کے لیے مستقل بنیادوں پر ان کی مدد کرتا ہوں۔

مجھے خدا نے بہت اچھے چچا سے نوازا ہے۔ ان کے ہاں اولاد نہیں تھی، اور ان کے پاس ساڑھے تین ایکڑ اراضی تھی جو انہوں نے میرے نام منتقل کر دی۔ میں نے وہ اراضی تقریباً تینتیس لاکھ پاکستانی روپے (تب 27,273 ڈالر) میں فروخت کی۔ ان پیسوں سے میں نے انسٹالمنٹ کارپوریشن کا کاروبار شروع کیا اور اب یہ میری آمدنی کا ذریعہ ہے۔ میرے بیٹے بھی گھر کے اخراجات میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ میں اپنے بھائی کے خاندان کا خرچہ بھی اٹھاتا ہوں۔ وہ میرے گھر کے بالائی حصے میں رہتے ہیں۔ اس کی بیٹیاں پنجاب کالج تاندلیانوالہ میں پڑھتی ہیں۔

اپنے کاروبار کے ذریعے میں ان لوگوں کو رکشے اور موٹر سائیکل دے سکتا ہوں جنہیں ان چیزوں کی مستقل ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کام جاری رکھنے کے لیے مجھے زمین بھی بیچنا پڑی۔ میں لوگوں کے لیے رکشہ خریدتا ہوں، ملکیت ان کے نام منتقل کرتا ہوں اور بدلے میں انہیں رکشہ کی قیمت کی ادائیگی تک مجھے روزانہ دو سو پاکستانی روپے (1.4 ڈالر) دینے ہوں گے۔ میں مزدوروں اور ایسے لوگوں کو موٹر سائیکلیں بھی دیتا ہوں جنہیں کام پر جانے میں مشکل ہوتی ہے۔ انہیں مجھے روزانہ 70 پاکستانی روپے (0.5 ڈالر) دینے ہوتے ہیں۔ مجھے یہ گاڑیاں انہیں سود پر فروخت کرنی پڑتی ہیں مگر میں کوشش کرتا ہوں کہ سود کم سے کم ہو۔

اپنی آمدنی سے میں معاشرے میں سرمایہ کاری کرتا ہوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتا ہوں۔ اگر گاؤں میں کوئی فوتگی ہو جائے تو میں جنازہ کے انتظامات کرتا ہوں۔ میں غریب لوگوں کی بیٹیوں کی شادی کے حوالے سے ان کی مدد کرتا ہوں۔ ان کے جہیز کے لیے انہیں پنکھے، استریاں، دھلائی کی مشینیں وغیرہ خرید کر دیتا ہوں۔ اس انٹرویو کے ریکارڈ ہونے سے کچھ ہی وقت پہلے میں نے ایک آدمی کو 2000 پاکستانی روپے (14 یو ایس ڈی) دیے جس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے بھوکے بچوں کو کھانا کھلانے کی سکت نہیں رکھتا۔ میرے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی ہے جو کہ میرے گاؤں میں ایک امتیازی خاصیت سمجھی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے مجھ سے ادھار لیا ہے میں نے ان کو بتایا ہے کہ اگر وہ مشکل میں ہوں یا زخمی ہوں تو پھر میں جتنی جلدی ممکن ہو سکا ان کی مدد کو پہنچوں گا۔ حال ہی

میں، میں نے اپنے گاؤں کے قریب ایک مزدور کی مدد کی ہے۔ اس نے مجھے فون کیا کہ وہ زخمی حالت میں ہے۔ میں اسے گجوانی ہسپتال لے گیا۔ اسے سمندری ہسپتال لے جانے کو کہا گیا تو میں اسے وہاں لے گیا۔ میں نے اسے 300 پاکستانی روپوں (2.4 یوایس ڈی) کی ادویات بھی خرید کر دیں۔ گاڑی کے ایندھن پر 500 روپے (3.5 یوایس ڈی) خرچ ہوئے جو میں نے خود اپنی جیب سے دیے۔ جب میں نے اسے گھر اتارا تو میں نے اس کے خاندان کے لیے گندم بھی دی۔

میں خاندانوں کے مابین کشیدہ معاملات میں بھی کردار ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک ایسا ہی معاملہ احمد کے خاندان کا تھا۔ لطیف اور احمد کے درمیان لڑائی ہوئی جس کے نتیجے میں لطیف کو گولی لگ گئی۔ لطیف کو فیصل آباد میں ایک ہسپتال لے جایا گیا جہاں وہ 10 سے 15 دن رہا مگر اس کے زخم اپنے شدید تھے کہ اس کی موت واقع ہوگئی۔ ایف آئی آر کے اندراج کے بعد احمد گرفتار ہوگیا۔ اسے جیل بھیج دیا گیا اور ٹرائل ابھی زیرالتوا ہے۔

میں نے فریقین کے مابین صلح کروانے کی بہت زیادہ کوشش کی۔ میں نے لطیف کے بچوں کو جنازے کے انتظامات کے لیے 5000 پاکستانی روپے (تب 41 یوایس ڈی) دیے۔ میں نے اس کے خاندان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں اور انہیں چاہیے کہ وہ خدا کے حکم کے مطابق معاف کر دیں۔ لطیف کا ایک بھائی مدعی جبکہ دوسرا گواہ تھا۔ ایک تیسرا گواہ بھی تھا۔

ایک رات وہ صلح پر آمادہ ہوگئے اور مجھ سے دیت کے طور پر 1,000,000 پاکستان روپے (8,197 یوایس ڈی) طلب کیے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس اس وقت اتنی زیادہ رقم نہیں ہے۔ اس سے وہ ناراض ہوگئے اور رقم کا تقاضا کرنے کے لیے ہر روز آنا شروع کر دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس دو دکانیں ہیں جو رقم کا بندوبست ہونے تک بطور ضمانت ان کے نام منتقل کی جاسکتی ہیں۔ جب میں دیت کا بندوبست کرلوں تو وہ مجھے میری دکانیں واپس کر دیں گے۔

میرے پاس ایک کار ہے جو میں انہیں دینے پر رضامند ہوگیا تاکہ وہ اسے فروخت کرسکیں۔ کار 700,000 پاکستانی روپے (تب 5,738 یوایس ڈی) میں فروخت ہوگی۔ میرے پاس کار کی دستاویزات تھیں اور میں نے کار کی ملکیت ان کے نام منتقل کرنے کے لیے ایک معاہدے کا مسودہ تیار کیا۔ مجھے باقی ماندہ رقم فیصل آباد میں رہائش پذیر اپنے کزن سے مل سکتی تھی۔ میں نے رات کے دو بجے انہیں اپنی کار دی اور اسی رات ہم فیصل آباد گئے اور بقیہ رقم اپنے کزن سے لی۔ شکر ہے کہ لطیف کے بیٹے عدالت گئے اور اپنے بیانات قلمبند کروائے جس کے بعد احمد کو رہائی مل گئی۔ عید قریب تھی اور ہم چاہتے تھے کہ وہ عید اپنے خاندان کے ساتھ گزارے۔ اپنے خاندان سے دور عید گزارنا بندے کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ اگر کوئی بندہ عید کے دوران جیل میں ہوگا تو وہ اپنا وقت روکر گزارے گا اور اس کے عزیز و اقارب دن گھر پر روکر گزاریں گے۔ اپنے تجربے کے بعد، میں چاہتا ہوں کہ کوئی بھی فرد عید اپنے خاندان سے دور نہ گزارے۔

> جب میں جیل میں تھا تو اس دوران پانچ لوگوں کو ایک مقدمے میں پھانسی دی گئی تھی۔ مقدمہ فیصل آباد سے باہر واقع ایک چھوٹے سے گاؤں کا تھا۔ دو افراد مجرم تھے جبکہ باقی تینوں مکمل طور پر بے قصور تھے۔ ان میں سے دو کو اس وقت نوعمر قرار دیا گیا جب جنرل مشرف نے جووینائل جسٹس سسٹم آرڈیننس **2002** متعارف کروایا تھا۔ انہیں ایک برس تک نوعمر تصور کیا گیا، مگر بعد میں مدعی فریق اور یونین کونسل انتظامیہ کی سازباز سے انہیں بالغ قرار دیا گیا۔ ان کی مدد کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔ ان سب کو **2005** میں پھانسی دے دی گئی۔

میں نے مدعی فریق کے گاؤں میں مدرسہ بنایا ہے اور اس کا نام اپنے بھائی سے منسوب کیا ہے۔ یہ ایک مسجد کے ساتھ منسلک ہے کیونکہ مدرسے کے عطیات طے شدہ ہیں۔ میں نے زمین خرید کر اس پر مدرسہ بنایا تاکہ اللہ میرے بھائی کو اس کا گناہ بخش دے۔

میرا بھائی ابھی بھی سزائے موت کا قیدی ہے۔ ہم اس کی بہت زیادہ کمی محسوس کرتے ہیں۔

اشرف

میں مراکیوال، سیالکوٹ میں رہتا ہوں۔ اس وقت میری عمر 50 برس ہے۔ جب میں بڑا ہو رہا تھا تو اس وقت ہمارے پاس گھر میں ایک ٹیلی ویژن تھا۔ یہ پورے گاؤں میں واحد ٹیلی ویژن تھا۔ میرے دادا اور دادی میری دیکھ بھال کرتے تھے مگر ابھی میں نوعمر ہی تھا کہ وہ فوت ہوگئے۔ میرا دادا پہلوان (اردو/ پنجابی: ریسلر)، تھا۔ اسی وجہ سے کھیلوں میں میری دلچسپی بھی بڑھی۔

میں میٹرک (دسویں جماعت) کرنے کے بعد 19 برس کی عمر میں فوج میں بھرتی ہوا اور سات برس تک ملازمت کی۔ ان دنوں آل پاکستان ٹورنامنٹ ہوا تھا اور میں کھیلوں کا ساز و سامان لینے گیا تھا۔ وہاں میری ملاقات فوج کے کوچ سے ہوئی۔ اس نے مجھے ٹیم کا حصہ بننے کو کہا۔ میں نے فوج کے لیے ہر قسم کا کھیل کھیلا بشمول جمناسٹک اور فٹ بال۔ فٹ بال میں میں مڈفیلڈر تھا میں اپنی پوزیشن پر کھیل سکتا تھا۔ میں ایک بندوقچی بھی تھا اور میرا بڑا اچھا نشانہ تھا۔ فوج میں میرا بہت زیادہ احترام کیا جاتا تھا۔ میرے یونٹ کے لوگ مجھے "چیتا" اور 'مردِ آہن' کہہ کر پکارتے تھے۔ مجھے فوج میں رہنا بہت پسند تھا۔ اس دوران مجھے سب سے اچھے فنکار اور کھلاڑی کے ایوارڈز ملے۔ جنرل کی بیوی کو موسیقی سے لگاؤ تھا اور وہ مجھے اپنے لیے اور گھر پر موجود دیگر لوگوں کے لیے گانے کے لیے بلاتی تھیں

میں چھٹی پر اپنے خاندان کو ملنے سیالکوٹ گیا ہوا تھا۔ میں کینٹ جانے کے لیے بس کے اڈے پر گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے لفٹ لی اور انہوں نے مجھے میری منزل پر اتارا۔ جن سے میں نے لفٹ لی تھی ان کی مجھے اتارنے کے بعد کسی سے لڑائی ہوگئی۔ تفتیش کے دوران، کسی نے کہا کہ کار میں ابتدا میں چھ لوگ تھے، چھٹا آدمی میں تھا۔ اس چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے میں اس مقدمے میں پھنس گیا۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں جہنم میں چلا گیا ہوں۔ پولیس میرے گھر آئی اور کہا کہ میں جرم میں ملوث تھا۔ ملزمان پر ڈکیتی اور قتل کا الزام لگا۔ مرنے والا فوج کے ایک جنرل کا کزن تھا جس وجہ سے اس کی طرف سے دباؤ تھا اور مدعی فریق کا مقدمہ مضبوط ہوگیا تھا۔

جب پولیس نے مجھے گرفتار کیا تو انہوں نے مجھے مارا پیٹا کیونکہ میں مسیحی تھا۔ اگرچہ مرکزی مجرم مجھے مقدمے میں ملوث کرنا چاہتا تھا مگر پھر بھی دیگر نے کہا کہ میں ملوث نہیں تھا اور یہ کہ مجھے اکیلا چھوڑ دینا چاہیے۔ میری گرفتاری دو دن تک ظاہر نہ کی گئی۔ مجھ سے اعتراف جرم کروانے کے لیے مجھے مارا پیٹا گیا۔ اس وقت صرف خدا ہی مجھے بچا سکتا تھا۔ پولیس ایک پولیس مقابلے کے ذریعے 'ہم سے چھٹکارا' پانا چاہتی تھی مگر ڈی آئی جی نے انکار کر دیا اور ہمیں ریمانڈ پر بھیج دیا۔

ایک ماہ کے ریمانڈ کے بعد، اپریل 1997 میں ٹرائل شروع ہوا۔ پہلے مقدمہ سیشن کورٹ سیالکوٹ کو بھیجا گیا اور پھر تین ماہ کے بعد گوجرانوالہ میں انسداد دہشت گردی عدالت کو بھیجا گیا۔ مدعی فریق نے اسے دہشت گردی کا واقعہ بنانے کے لیے دباؤ ڈالا حالانکہ ہمارے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ ہماری ضمانت نہ ہوسکی۔

میرا وکیل ریاست کا مقرر کردہ تھا کیونکہ میرا خاندان پرائیوٹ قانونی مدد کی استعداد نہیں رکھتا تھا۔ صرف میں ہی

تھا۔ باقی سب نے پرائیوٹ وکیل کیے ہوئے تھے۔

میڈیکل افسر کی شہادت کے دوران، ایک میڈیکل رپورٹ پیش ہوئی جس میں لکھا ہوا تھا کہ جسم میں گولی نہیں تھی اور مرنے والا دل کا دورہ پڑنے سے مرا تھا۔ جج نے ڈاکٹر کے ساتھ بحث شروع کر دی، اور کہا، 'میڈیکل رپورٹ میں کچھ بھی نہیں ہے! میں انہیں سزا کیسے دوں گا؟' اس کے چہرے پر پریشانی تھی، اس نے ہماری طرف دیکھا اور کہا کہ اسے اعلیٰ حکام سے حکم ملا ہے کہ وہ ہم سب کو سزا دے اور رہا نہ کرے۔ اس نے کہا کہ عدالت عالیہ ہمیں رہا کر سکتی ہے۔ جج نے جو کچھ کہا تھا اس پر ایک ملزم نے اس کے ساتھ جھگڑنا شروع کر دیا اور انصاف کا مطالبہ کیا۔ جج کا جواب تھا کہ اس پر ایسا کرنے کے لیے دباؤ ہے۔

متوفی کا بیٹا اور بیوی بطور گواہ پیش ہوئے۔ گواہی دینے والا واحد پولیس افسر کینٹ پولیس اسٹیشن کا ہاؤس آفیسر تھا جو تحقیقاتی افسر بھی تھا۔

قانونی کاروائی کے دوران جو کچھ ہوا مجھے اس کی سمجھ آ گئی تھی۔ میں بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی حالت میں عدالت میں تھا۔ وہاں بہت زیادہ سیکیورٹی تھی۔ جب ہم عدالت گئے تو سوچا کہ ہم پولیس مقابلے میں مار دیے جائیں گے مگر ٹرائل ختم ہونے کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ ہم محفوظ تھے۔ ٹرائل کو مکمل ہونے میں چھ ماہ لگے۔ مجھے دیگر دو لوگوں کے ساتھ سزائے موت دی گئی اور تین لوگوں کو عمر قید سنائی گئی۔

میں نے عدالتی فیصلے کی ایک نقل حاصل کی اور اسے پڑھا بھی۔

1997 میں اپیل دائر کی گئی مگر سماعت 2003 میں شروع ہوئی۔ اپیل کی سماعت شروع ہونے تک میں چھ برس جیل میں گزار چکا تھا جن میں سے ساڑھے پانچ برس سزائے موت کے قیدی کی حیثیت سے میں نے جیل میں بسر کیے۔ لاہور ہائی کورٹ میں چار ججوں کے بنچ نے اپیل کی سماعت کی۔ ریاست نے میرے لیے ایک وکیل مقرر کیا تھا۔ میں کبھی بھی اپنے وکیل سے نہیں ملا نہ ہی میں اپنی اپیل کی سماعت پر کبھی ہائی کورٹ گیا۔ مجھے عدالت کی تاریخوں کا پتہ تھا کیونکہ جب کبھی فون پر میری اپنے خاندان سے بات ہوتی تو وہ اس کی بابت مجھے بتاتے تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں اپنی اپیل کی سماعت سننے کے لیے عدالت جاتا کیونکہ عدالت میں جو کچھ ہو رہا تھا میں اس کے بارے میں لاعلم تھا۔ میرا وکیل مجھ سے ملنے کے لیے کبھی جیل نہیں آیا۔ میں وکیل کو صرف اس وجہ سے جانتا تھا کہ مجھے ایک دستاویز ملی تھی جس پر لکھا تھا کہ وہ میرا وکیل تھا۔ میری سزا عمر قید میں تبدیل کی گئی اور کہا گیا کہ جرمانے کی عدم ادائیگی پر مجھے مزید قید بھگتنا ہوگی۔ صرف غلام کی سزائے موت کو برقرار رکھا گیا تھا۔ غازی، مرکزی ملزم جس نے مبینہ طور پر مقتول پر گولی چلائی تھی، کو تقریباً دو سال قبل 2016-2017 میں پھانسی دے دی گئی تھی۔ میں غلام کو جانتا تھا کیونکہ ہم ایک ہی گاؤں سے تھے۔

ہائی کورٹ کا فیصلہ انگریزی میں تھا اور میں نے کسی فرد سے پڑھوایا تھا۔ میں انگریزی نہیں پڑھ سکتا اور میری خواہش تھی کہ فیصلہ اردو میں ہوتا تاکہ میں اسے پڑھ سکتا۔

مجھے جن چیزوں کا شوق ہے ان میں سے ایک سنگیت کاری ہے۔ میں ملفا قسم کے کلاسیکل سنگیت گاتا ہوں بشمول مہدی حسن، لتا منگیشکر، محمد رفیع، اور نور جہاں کے سنگیت۔ میں چرچ کوئر میں گاتا تھا اور پیشہ ورانہ طور پر بھی۔

مجھے جیل میں استاد کہا جاتا تھا کیونکہ جیل میں ہر کوئی مجھے محبت کرتا تھا۔ میں ہر چیز صاف ستھری رکھتا تھا۔ میں جیل میں قالین بناتا تھا اور جیل کے گرجا کا انچارج تھا۔ گرجا میں ہماری سنگیت کاروں کی ایک ٹولی تھی جس سے مجھے بہت لگاؤ تھا۔ ہمارے پاس ایک طبلہ اور ایک ہارمونیم تھا۔ میں جیل میں اہم تقریبات پر بھی گاتا تھا، خاص طور پر قومی ترانہ۔

میں محرم کے دوران غیر-مسیحی تقریبات پہ بھی گاتا تھا۔ قید کے دوران میں نے جڑی بوٹیوں سے علاج معالجہ کرنا سیکھا۔ شام کے وقت میں قیدیوں کو کھیلوں کی تربیت دیتا تھا۔ بیرک میں کچھ کرنے کے لیے کافی جگہ ہوتی تھی۔ کھیلوں کا ساز و سامان عطیے میں ملتا تھا۔ جیل انتظامیہ نے ہمیں کچھ نہ دیا۔

جیل میں پہلی رات 'زمین پر دوزخ' کی طرح تھی۔ میں پوری رات سو نہ سکا۔ پہلی رات کے دوران لوگوں نے اپنے حواس کھو دیے تھے۔ وہ سونے کے لیے منشیات استعمال کرتے ہیں۔ کچھ لوگ پاؤڈر (ہیروئن) لیتے ہیں۔ میں نے منشیات استعمال نہیں کی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے استعمال کی تو یہ مجھے مار دے گی۔ جیل میں پہلے تین دنوں کے دوران میں نے جیل میں اپنا وقت گزارنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کیا۔ جب میں جیل کی لمبی دیواروں کو دیکھتا تو سوچتا کہ میں اتنا زیادہ عرصہ ان کے پیچھے کیسے گزاروں گا۔ لیکن پھر میں دیواروں کا عادی ہو گیا۔ میرے خاندان نے میری شادی کے لیے مجھ پر دباؤ ڈالا مگر میں نے نہ کی کیونکہ میں جیل میں تھا۔

میں نے ڈسٹرکٹ جیل سیالکوٹ میں چھ برس گزارے اور باقی عرصہ کوٹ لکھپت جیل لاہور میں گزارا۔ جب میں سیالکوٹ جیل میں گیا تو وہاں مسیحوں کے لیے کوئی گرجا نہیں تھا۔ جیل انتظامیہ کو اس مسئلے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ٹی۔ سراج جو پیشے کے لحاظ سے وکیل ہیں اور اس وقت جیل میں بند تھے، نے جیل حکام کے ساتھ گرجا کے لیے بات چیت کرنا شروع کی اور بالآخر کامیاب ہو گئے۔ پھر ہم گرجا کے اندر سوئے۔

کوٹ لکھپت میں گرجا کی حالت بہت خراب تھی کیونکہ اس کی دیواریں ٹوٹ رہی تھیں اور ان میں سوراخ تھے اور لوگ وہاں کوڑا پھینکتے تھے۔ یہ مسجد کے بھی پیچھے تھا اور لوگ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ہم نے گرجا کی مرمت کے لیے فنڈ اکٹھا کرنا شروع کیا۔ مسلمانوں نے بھی عطیہ دیا۔ سیالکوٹ میں، سزا یافتہ مسیحیوں کی تعداد 100 سے 150 کے درمیان تھی جبکہ 500 سے 600 کے درمیان ایسے مسیحی تھے جن کا ٹرائل جاری تھا۔

فنڈز سے ہمارے پاس اتنا پیسہ جمع ہو گیا تھا کہ گرجا کے اندر ٹائلیں لگا سکیں۔ باہر، اگلے حصے پر اور صحن میں سنگ مرمر لگایا گیا۔ ہم نے سوراخوں پر پلستر لگایا۔ صحن میں ہم نے پھول اور پودے لگائے۔ ہم نے گرجا کے ساتھ ایک غسل خانہ بھی بنوایا تاکہ گرجا آنے والی عورتیں اسے استعمال کر سکیں کیونکہ اور کوئی سہولت نہیں تھی۔ گرجا بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ جو لوگ جیل کا دورہ کرتے وہ اس کی تصویریں بناتے کیونکہ وہ بہت خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔

مجھے ایسا لگا کہ جیل میں قید کے دوران خدا کے ساتھ میری قربت پیدا ہو گئی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ خدا نے میری روحانی زندگی بہتر کر دی تھی اور مجھے برائی سے دور رکھا۔ جیل میں ایسے لوگ بھی تھے جو کالا جادو کرتے تھے۔ وہ مجھ سے دور رہتے تھے کیونکہ ان کی نظر میں، میں انسان نہیں تھا کیونکہ میں بہت زیادہ پاک دامن تھا۔ کہا جاتا تھا کہ میں نور ہوں۔ خدا اپنے کام کے لیے

مجھے جن چیزوں کا شوق ہے ان میں سے ایک سنگیت کاری ہے۔ میں ملفا قسم کے کلاسیکل سنگیت گاتا ہوں بشمول مہدی حسن، لتا منگیشکر، محمد رفیع، اور نور جہاں کے سنگیت۔ میں چرچ کوئر میں گاتا تھا اور پیشہ ورانہ طور پر بھی۔

قانونی کاروائی کے دوران جو کچھ ہوا مجھے اس کی سمجھ آ گئی تھی۔ میں بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی حالت میں عدالت میں تھا۔ وہاں بہت زیادہ سیکیورٹی تھی۔ جب ہم عدالت گئے تو سوچا کہ ہم پولیس مقابلے میں مار دیے جائیں گے مگر ٹرائل ختم ہونے کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ ہم محفوظ تھے۔ ٹرائل کو مکمل ہونے میں چھ ماہ لگے۔ مجھے دیگر دو لوگوں کے ساتھ سزائے موت دی گئی اور تین لوگوں کو عمر قید سنائی گئی۔

مجھے استعمال کرتا ہے۔ خدا نے میری حفاظت کی۔ جیل میں میری قید کے دوران خدا میرے ساتھ تھا۔ قید کے دوران میں اپنا وقت خدا کی خدمت میں گزارتا تھا۔

صبح کے وقت میں صفائی کرتا اور گرجا کی دیکھ بھال کرتا۔ دوپہر کے کھانے تک ہم گانے گا کر وقت گزارتے۔ ہم صاف ستھرا ہو کر دوپر کا کھانا کھاتے۔ ہمیں کھانا پکانے کے لیے کوئلہ اور کوئلہ سے جلنے والا چولہا دیا گیا تھا۔ کھانے کو زیادہ ذائقہ دار بنانے کے لیے ہم اسے تڑکا بھی لگاتے تھے۔ شام کے تقریباً ساڑھے چار بجے ہمیں کمروں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ اتنی جلدی تو مرغیوں کو بھی بند نہیں کیا جاتا۔

جیل میں میری قید کے دوران، کچھ مثبت چیزیں بھی تھیں۔ مثال کے طور پر، جیل سے باہر گھر پر شام کے کھانے کے وقت صرف ایک طرح کا کھانا دستیاب ہوگا، مگر جیل میں ہمارے پاس سات طرح کا کھانا ہوتا تھا کیونکہ دوسرے قیدی بھی کھانا بناتے تھے اور ہم ایک دوسرے کو کھانا دیا کرتے تھے۔ قید کے دوران مجھے کوئی بیماری نہیں لگی سوائے زکام کے۔

جیل میں مجھے صرف میرے والد ملنے آیا کرتے تھے اور وہ بھی اپنا فریضہ سمجھ کر آتے تھے۔ میں نے اپنے خاندان سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ میرے خاندان نے میری قید کے دوران میرے آدھی زمین بیچ دی تھی اور اسے اپنے پر ضائع کر دیا۔ انہیں میرا کچھ خاص خیال نہیں۔

میں جیل میں قالین کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ قالین بافی کے کام سے نکلنے والی گرد سے کئی لوگ تپ دق کے مریض بن گئے۔ ہمیں معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا مگر پھر بھی ہمیں کام کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے پاس قالین بنانے کی 15 برس کی تربیت تھی۔ میں 'نقشہ ساز' بن گیا چنانچہ دوسروں کو قالینوں کے کے ڈھانچوں، رنگوں اور ساخت پر ہدایات دیتا تھا۔

میں نے 2014 میں قید کے اٹھارہویں برس اپنی عمر قید کا دورانیہ مکمل کیا۔ پھر میں نے جرمانہ ادا نہ کرنے کے عوض سزا بھگتی۔ مجھے ادائیگی کے نادہندہ بننے کی وجہ سے تین برس قید کاٹنی پڑی۔ جرمانوں کی عدم ادائیگی پر قید زیادہ سخت تھی۔ یہ بہت تکلیف دہ یاددہانی تھی کہ میں غریب ہوں۔ میرے ساتھ دیگر سزا پانے والے سب جیل سے باہر تھے کیونکہ وہ جرمانہ دینے کی استعداد رکھتے تھے۔

ایک دن مجھے دفتر بلایا گیا۔ وہاں کچھ لوگ میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کون ہیں مگر انہوں نے مجھے نہ بتایا اور کہا کہ وہ مجھے جیل سے باہر نکالنے کے لیے آئے ہیں۔ میرے خیال میں وہ فرشتہ تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ میرا جرمانہ ادا کرنے والے ہیں

میں نہیں جانتا کہ میں اپنی زندگی کیسے گزاروں۔ میرے موجودہ مسائل میرے جیل کے مسائل سے زیادہ گھمبیر ہیں۔ میں ڈر گیا تھا جب میں جیل سے باہر آیا تھا کیونکہ میری قید کے دوران بہت کچھ تبدیل ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں خود کو زندہ تصور نہیں کرتا؛ ایسا لگتا ہے کہ میں موت کا انتظار کر رہا ہوں، مگر دو برس بعد ان کی رائے تبدیل ہو گئی۔ پولیس مجھے غیر ضروری طور پر گرفتار کر لیتی اور کہتی کہ میں نے خود کو ان کے سامنے پیش نہیں کیا۔ قریب قریب 50 افراد نے مداخلت کی اور ایک اشٹام پر بیان دیا کہ میں ایک معزز انسان ہوں اور میں نے کوئی غلط کام کیا تو وہ اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے پریشان کرنا چھوڑ دیا۔

اور یہ کہ مجھے جیل چھوڑنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ انہوں اصرار کیا کہ وہ وہیں ٹھہریں گے اور میرے ساتھ ہی جیل سے باہر جائیں گے۔ یہ سن کر مجھے اتنی زیادہ خوشی ہوئی کہ مجھے لگا کہ مجھے دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ میری دعائیں آخر کار قبول ہو گئی تھیں۔ میں گرجا گیا اور عبادت کی۔ جب میں وہاں تھا کہ کوئی آدمی میری طرف آیا کیونکہ وہ پریشان تھے کہ میں چیخیں مار رہا تھا۔ میں نے جو کچھ ہوا تھا اس کا اسے بتایا تو وہ چلا گیا اور سب کو بتا دیا۔ میرے پاس لوگ آنا شروع ہو گئے انہوں نے مجھے کپڑوں اور جوتوں سمیت تحائف دیے۔ میں نے اپنی چیزیں اکٹھی کیں اور فرشتوں کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ وہ مجھے اس جگہ اتار دیں گے جہاں میں کہوں گا یا پھر میری ٹکٹ کے پیسے دیں گے مگر میں نے انکار کیا۔

میں نے باہر آ کر ایک دوست کو فون کیا اور وہ مجھے لینے آیا اور اپنے گھر لے گیا۔ جب میں پہنچا تو اس نے سب سے میرا تعارف کروایا اور بتایا کہ میں کیسے کسی کو پریشان نہیں کروں گا اور کیسے دوسروں کے جھگڑے ختم کرواؤں گا۔ انہوں نے بہت زیادہ اچھی میزبانی کی اور میں چند دن ان کے ہاں رہا۔ میں نے اس شام گھر فون کیا اور انہیں بتایا کہ میں چند دنوں تک گھر آ رہا ہوں۔ میں نے طارق سراج کو فون کیا اور عید الاضحیٰ کے دوران ان کے ساتھ رہا۔

جب میں گھر واپس گیا، مجھے پتہ چلا کہ میرا خاندانی گھر فروخت ہو چکا ہے اور موجودہ گھر کی کافی زیادہ مرمت ہونے والی ہے۔ میں اپنے گھر کی مرمت میں حصہ ڈالنا چاہتا تھا اس لیے میں نے لاہور میں دستانے کاٹنے والی ایک فیکٹری میں کام کرنا شروع کر دیا۔ میں نے ایک کمیٹی کی بھی رقم لی جس کا میں حصہ تھا۔ اس رقم سے میں گھر کو پلستر کروا سکتا تھا۔ میرا خاندان نہیں چاہتا تھا کہ میں شادی کروں کیونکہ یہ ایک اضافی بوجھ ہوتا اور میری شریک حیات چھوٹے سے گھر میں کچھ جگہ لے لیتی۔

میں اپنے والدین کے کمرے میں سوتا ہوں کیونکہ اور کوئی کمرہ دستیاب نہیں ہے۔ شادی کرنے کے لیے میرے پاس پیسے ہونا ضروری ہیں۔ قریب قریب دو ماہ پہلے میں نے اپنی کپڑوں کی دکان کھولی۔ میں دوسروں کے لیے کچھ نچلے درجے کے کام بھی کرتا ہوں۔ کچھ عرصہ تک میں ایک مقامی اسکول میں جسمانی تربیت کار بھی رہا۔ دکان چلانا بہت اچھا کام ہے کیونکہ دن تیزی سے گزرتا ہے حالانکہ اس وقت بھی جب میرے پاس گاہک نہیں ہوتے۔ میں اپنی کھیلوں کی اکیڈمی کھولنا چاہتا ہوں اور عورتوں کو بھی تربیت دینا چاہتا ہوں مگر یہ کام کرنے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ میں اپنی زندگی کیسے گزاروں۔ میرے موجودہ مسائل میرے جیل کے مسائل سے زیادہ گھمبیر ہیں۔ میں ڈر گیا تھا جب میں جیل سے باہر آیا تھا کیونکہ میری قید کے دوران بہت کچھ تبدیل ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں خود کو زندہ تصور نہیں کرتا؛ ایسا لگتا ہے کہ میں موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ کئی لوگ مجھے سے دور رہے اس وجہ سے کہ میں قید میں رہا ہوں، مگر دو برس بعد ان کی رائے تبدیل ہو گئی۔ پولیس مجھے غیر ضروری طور پر گرفتار کر لیتی اور کہتی کہ میں نے خود کو ان کے سامنے پیش نہیں کیا۔ قریب قریب 50 افراد نے مداخلت کی اور ایک اشٹام پر بیان دیا کہ میں ایک معزز انسان ہوں اور میں نے کوئی غلط کام کیا تو وہ اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے پریشان کرنا چھوڑ دیا۔

پاکستان کو سزائے موت ختم کرنی چاہیے کیونکہ عمر قید بذات خود اتنی ظالمانہ ہے اور بندے کو تباہ کر دیتی ہے۔ کچھ اس طرح کا منصوبہ ہونا چاہیے کہ جو لوگ جیل سے نکلیں ان کی مدد کی جائے تاکہ وہ اپنی زندگی از سر نو شروع کر سکیں۔

جیلوں کو بھی بہت زیادہ اصلاح ضرورت ہے۔ وہ بہت گندی ہیں اور مکھیوں و جووں سے بھری پڑی ہیں۔ ہمیں کھیلوں کا سامان بھی ملنا چاہیے۔ جیل میں تفریح اور کھیلوں کے لیے ایک خاص وقت سے ہر کوئی تازہ دم اور صحت مند رہے گا۔

آخر میں، میں عبرانیوں 3:13 کی مثال دینا چاہوں گا,

"جو قید ہیں، اُن کو ایسے یاد رکھیں جیسے آپ بھی اُن کے ساتھ قید ہوں اور اُن کو بھی یاد رکھیں جن کے ساتھ بدسلوکی ہو رہی ہے کیونکہ آپ بھی گوشت پوست کے اِنسان ہیں۔"

کیا سرفروشی کی تمنا کا نعرہ لگانے والی لڑکیاں ہی تبدیلی لائیں گی؟

وسعت اللہ خان

فیض احمد فیض کی یاد میں لاہور میں ہر سال میلہ لگتا ہے اور اس میلے میں سب سے زیادہ اقبال بانو کی آواز میں وہ نظم ہی سنائی دیتی ہے: 'لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے، وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے۔'

لیکن اس بار فیض میلے میں جس نظم کو سب سے زیادہ ٹی آر پی حاصل ہوئی وہ تھی رام پرساد بسمل عظیم آبادی کی 98 سالہ پرانی نظم 'سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے، دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے'۔

سب جانتے ہیں کہ شہیدِ اعظم بھگت سنگھ پر جو بھی فلمی کھیل بنتا ہے اس میں یہ نظم ضرور ڈالی جاتی ہے۔ لیکن رواں سال پاکستان کی نوجوان نسل نے نسل در نسل چلی آنے والی اس نظم کو ایک نئی زندگی دی۔

کچھ سرپھرے نوجوانوں نے اس نظم کو فیض میلے میں نعرے کے طور پر گایا۔

اس مجمع میں سب سے پرجوش اور بلند آواز عروج اورنگزیب کی تھی۔ اس وقت سے عروج اورنگزیب کم از کم سوشل میڈیا کی حد تک نئی نسل کے لیے جوش و خروش کی علامت بن گئی ہیں۔

کوئی بھی ملک میں جو ایک طویل عرصے سے حقیقی تبدیلی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے وہاں اگر کوئی خاتون سٹار بن کر ابھرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تبدیلی کی بھوک کتنی گہری ہے۔

جیسے یمن میں جب سنہ 2011 میں بہارِ عرب کی لہر آئی تو علی عبداللہ صالح کی آمریت کو چیلنج کرنے والوں توکل کرمان پیش پیش تھیں۔

توکل کرمان کو رواں سال نوبل انعام سے بھی نوازا گیا ہے۔

انڈیا کی معروف یونیورسٹی جے این یو میں جب تین سال قبل حکومت کی مداخلت کے خلاف مظاہرے ہوئے اس وقت پاکستانی طلبا میں دو مقبول نام کنہیا کمار اور شہلا رشید کے تھے۔

دسمبر سنہ 2017 میں حجاب پر حکومتی جبر کے خلاف مظاہروں میں وداع موحد کی تصویر سب سے زیادہ وائرل ہوئی۔

وداع نے تہران میں ایک اونچی جگہ چڑھ کر اور اپنے سفید سکارف کو پرچم کی طرح لہرایا۔ وہ گرفتار بھی ہوئیں لیکن ان کی تصویر نے باقی ایرانی خواتین کو متاثر کیا۔

گذشتہ اپریل میں سوڈان کے دارالحکومت خرطوم میں فوج کے ہیڈ کوارٹر کے سامنے کئی دنوں تک جس نوجوان بھیڑ نے مظاہرہ کیا اس دھرنے کو سفید لباس میں ملبوس ایک 22

سالہ لڑکی آلاء صلاح لیڈ کر رہی تھی۔

بیروت میں بدعنوان حکومت اور سیاست کے خلاف گذشتہ دو ماہ سے جو تحریک جاری ہے اس میں بھی خواتین سب سے آگے ہیں۔

ان میں سے ایک خاتون جنھوں نے وزیر کے باڈی گارڈ کو کک ماری اس کا ذکر تو آج تک ہو رہا ہے۔

پاکستان میں انسانی حقوق کی وکیل عاصمہ جہانگیر کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ 'پاکستان کا سب سے زیادہ دلیر مرد' تھیں۔

دو سال قبل ان کی موت کے بعد کچھ عرصے سیاسی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اب عروج اورنگزیب، جلیلہ حیدر گریٹا تھنبرگ جیسی لڑکیوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جو تبدیلی ہماری نسل نہ لا سکی شاید اکیسویں صدی میں یہ لڑکے لڑکیاں لے آئیں اور ہم انھیں کامیاب دیکھ کر تھوڑا سا خوش ہو لیں اور اپنی ناکامی بھول سکیں، تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی!

(بشکریہ بی بی سی اردو)

کاروکاری کے تصور نے ایک اور جان لے لی

ڈیرہ اللہ یار ڈیرہ اللہ یار میں شوہر نے کاروکاری کے شبہ میں اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ 23 نومبر 2019 کو ڈیرہ اللہ یار کے علاقہ گوٹھ پیرل رند میں ملزم رحیم بخش نے کاروی کاری کے شبہ میں اپنی مسماح کو قتل کر دیا اور موقع سے فرار ہو گیا۔

(فرید احمد)

بیٹی کی بازیابی کا مطالبہ

حیدرآباد لطیف آبادی کے رہائیشی نور محمد نے سندھ ہائی کورٹ میں ایک درخواست دائر کی ہے جس میں انہوں نے مؤقف اختیار کیا ہے کہ 2008 میں ان کی بیٹی کو اغواء کیا گیا تھا جسے تا حال بازیاب نہیں کروایا جا سکا۔ پولیس نے مقدمہ درج کیا تھا مگر اس کے علاوہ کوئی عملی پیش رفت نہیں کر سکی۔ درخواست گزار کے مطابق، اسے شبہ ہے کہ اس کی بیٹی اس کے سابق پڑوسیوں قاسم ملاح اور آمنہ ملاح کے پاس ہے مگر پولیس اس حوالے سے کوئی بامعنی تحقیقات نہیں کر رہی۔ عدالت کے طلب کرنے پر متعلقہ پولیس افسر پیش ہوئے اور عدالت کو یقین دہانی کروائی کہ وہ دو ہفتوں کے اندر اندر لڑکی کو بازیاب کر لیں گے۔

(لالہ عبدالحلیم)

ہتھیار ڈال کر قومی دھارے میں شامل ہونے والے دو بھائی قتل

کوئٹہ 17 نومبر، 2019 کو کوئٹہ کے علاقے کیل شابو میں نامعلوم افراد نے فائرنگ کر کے دو سگے بھائیوں کو قتل کر دیا۔ قتل ہونے والے دوران خان اور عبدالعزیز ولد شادیاں خان ایک سال قبل ہتھیار ڈال کر قومی دھارے میں شامل ہوئے تھے۔ دونوں کو نامعلوم افراد نے فائرنگ کر کے قتل کر دیا اور موقع سے فرار ہو گئے۔ قتل کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی اور پولیس نے نامعلوم افراد کے خلاف آئی آر درج کر لی۔

(فرید احمد)

ہم کیا کریں گے؟

زاہدہ حنا

اکیسویں صدی آغاز ہوئی تو ہمارا خیال تھا کہ انسان نے بیسویں صدی کی خوں ریزیوں سے بہت کچھ سیکھا ہوگا اور اکیسویں صدی امن چین کی صدی ہوگی لیکن نائن الیون نے پہلے برس سے دنیا کو سر کے بل کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد سے اب تک کرہ ارض پر رہنے والوں کو چین نہیں آیا۔ مشرق وسطیٰ کی سڑکیں خون سے نہا گئیں۔ آج ہانگ کانگ میں لاکھوں لوگ کوچہ و بازار میں ہیں۔

پاکستان کے مختلف بڑے اور چھوٹے شہروں میں ہزاروں طلبا سرخ پرچم لہراتے اور چی گویرا کی تصویریں اٹھائے یونین سازی کا اپنا حق مانگنے نکلے ہیں۔ مقتدرین انھیں بتا رہے ہیں کہ یونیورسٹیاں تشدد کا مرکز ہیں اور یونین سازی کے اصول مقتدرین طے کریں گے۔ ایسے میں ملک کے دانشوروں، ادیبوں، صحافیوں اور مزدور رہنماؤں کا خاموش رہنا اور ان کا احتجاج کرنے والوں کے شانہ بہ شانہ، نہ چلنا کسی جرم سے کم نہیں۔

اس حوالے سے سیکڑوں ہزاروں برس پہلے دانشور اور اہل قلم اپنی ذمے داریوں کے اصول متعین کر گئے ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے غور و فکر سے اپنے سماج کو تبدیل کیا اور فکری ارتقا کی راہیں نکالیں۔ ان مرحلوں سے گزرتے ہوئے کچھ اپنی جان سے گئے، کچھ نے جلاوطنی سہی، کچھ غدار اور گمراہ ٹھہرے۔ یہ ڈھائی ہزار برس پہلے کے یونانی تھے جنہوں نے سچ اور باضمیری کے نہایت کڑے معیار قائم کیے۔

سقراط کا ''صفائی کا بیان'' ہم پڑھتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں۔ سقراط پر دیوتاؤں سے بغاوت اور شہر کے نوجوانوں کو گمراہ کرنے کا الزام تھا۔ اس پر بغاوت کا مقدمہ چلا اور موت کی سزا سنائی گئی۔ وہ جب اپنا دفاع کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو اس نے کہا ''اے ایتھنز والو! جب تک میری جان میں جان ہے اور بدن میں طاقت ہے، میں فلسفے پر عمل کرنا اور اس کی تعلیم دینا نہیں چھوڑوں گا۔

تم مجھے رہا کر دیا نہ کرو، دونوں صورتوں میں یہ جان لو کہ میں اپنا راستہ کبھی نہیں بدلوں گا۔'' سزائے موت سے چند گھنٹوں پہلے جب اس کے دوستوں نے اسے قید خانے سے فرار کرانا چاہا تو اس نے یہ کہہ کر ان کی پیشکش ٹھکرا دی کہ ''میں دنیا سے ایک ظالم کی حیثیت سے نہیں ایک مظلوم کے طور پر رخصت ہونا چاہتا ہوں۔''

تاریخ اسلام کے صفحوں پر ہمیں ابن رشد، منصور حلاج، رازی اور سرمد ایسے متعدد کردار ملتے ہیں جن میں سے کئی اپنے افکار و خیالات کی وجہ سے زندگی، زندان میں گزار کر ختم ہوئے۔ کسی نے سولی پر یوں جان دی کہ اس کا بدن تین دن اور تین رات کتر اجاتا رہا اور کسی کی گردن جامع مسجد، دلی کی سیڑھیوں پر اڑا دی گئی۔

دانشوروں اور اہل قلم نے اپنی ذمے داریوں کو سولہویں صدی سے ہی بہت شدت سے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ 1600ء میں اپنے عہد کے ایک بڑے دانشور، شاعر، ریاضی داں اور ہیئت داں برونو سے کلیسا بہت ناراض تھے۔ اس کے سائنسی خیالات کی زد مذہب عقائد پر پڑتی تھی۔

اسے گرفتار کیا گیا اور سات برس تک اس پر مذہبی عدالت میں مقدمہ چلا۔ برونو کو موت کی سزا سنائی گئی اور سیکڑوں افراد کی موجودگی میں روم کے ایک چوک میں ناقابل یقین تشدد کے بعد اسے زندہ جلا دیا گیا اور لوگ کلیسا کے حق میں پُر جوش نعرے لگاتے رہے۔ برونو کو تاریخ میں سائنس کا پہلا شہید کہا گیا ہے۔ برونو کی ہلاکت کے 16 برس بعد گلیلیو نے بھی خیال دشمن پادریوں کے سامنے ایک توہین آمیز مقدمے کا سامنا کیا۔ برونو اور گلیلیو وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی علمی اور سائنسی تحقیقات پر اصرار نہ کیا ہوتا تو انسان چاند پر قدم نہ رکھ سکتا تھا اور نہ جہاز کروڑوں میل دور سے مریخ کے احوال کی خبر لاتا۔

صنعتی انقلاب اور چھاپے خانے کی ایجاد نے اہل قلم اور اہل دانش کی ذمے داریوں کو روز افزوں کیا۔ اپنے رجعت پسند اور عقل دشمن سماج کو بدلنے کی کوشش کرنے والوں میں روسو اور والٹیر سامنے کے نام ہیں۔ انقلاب فرانس کی بنیادیں ان کے خیالات پر استوار ہوئیں۔ حقوق انسانی، آزادی تحریر و تقریر، دنیا کے تمام انسانوں کے لیے مساوی حقوق اور عدل و انصاف کا آوازہ آج دنیا کے ہر کونے میں سنا جا رہا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں تھامس پائین جیسے متعدد دانشوروں نے انسانی حقوق رائج کرنے کے لیے بھاری قیمت ادا کی۔ عورتوں کے حقوق کے لیے جون اسٹوارٹ اور دوسروں نے کتابیں لکھیں۔ میری اسٹون وال کرافٹ سے ورجینیا وولف اور ایما گولڈمان تک درجنوں دانشور عورتیں تھیں جنھوں نے اپنے قلم اور عمل سے عورتوں کے مساوی حقوق کی لڑائی لڑی جو آج تک جاری ہے۔ اسی طرح مارکس نے جلاوطنی اور مفلسی کی زندگی گزار کر دنیا بھر کے مزدوروں اور محنت کشوں کو منظم کیا اور سوشلسٹ انقلاب کی بنیاد رکھی۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی سیاسی اور سماجی شکست و ریخت کی صدیاں تھیں۔ شاہی، جاگیرداری اور اشرافیہ پسپائی پر تھی۔ مساوات، عدل و انصاف، غلامی کے خاتمے اور جمہوریت کے قیام کے لیے سیکڑوں اہل قلم کی جدوجہد جاری تھی۔ اخباروں اور جریدوں کی اشاعت کے سبب شخصی اور مذہبی آزادی کے معاملات لوگوں کی توجہ کا مرکز بن رہے تھے۔

یہ انیسویں صدی کے آخری دن تھے جب فرانس میں ایک یہودی فوجی افسر پر چلنے والا مقدمہ فرانس کے مشہور ادیب ژولا کو مضطرب کر گیا۔ اس نے 1898 میں فرانسیسی صدی کے نام ایک کھلا خط اخبار میں شایع کرایا۔ یہ خط تاریخ میں J Accuse کے نام سے مشہور ہے۔ اس خط نے مجبور، مفلس اور بے آسرا اقلیتوں کے حقوق کی لڑائی کا سرنامہ لکھا۔ ژولا کو ایک اعلیٰ عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ جان بچانے کے لیے اسے انگلستان میں پناہ لینی پڑی۔ کرنل ڈریفس پر دوبارہ سے مقدمہ چلا اور جب اس کی بے گناہی ثابت ہوگئی تو ژولا کی عزت اور احترام میں بے حد اضافہ ہوگیا۔

بیسویں صدی کی تیسری، چوتھی اور پانچویں دہائی میں یورپ نے نازی فاشزم اور دوسری جنگ عظیم کو جھیلا۔ لاکھوں لوگ یہودی ہونے کے جرم میں ہلاک کیے گئے۔ ان کے لیے انصاف مانگنے اور فاشزم سے لڑنے والے جرمن ادیب، سائنسدان اور دانشور جان بچانے کے لیے یورپ کے ایک سے دوسرے ملک میں پناہ لیتے رہے۔ بریخت، ہرمن ہیسے، تھامس مان، اسٹیفن ژویگ اور فرائیڈ اس کی سامنے کی مثال ہیں۔

1945 میں جاپان کے دو شہروں پر امریکا کا ایٹمی حملہ دنیا بھر کے دانشوروں اور اہل قلم کو دہلا گیا۔ رسل، آئن اسٹائن، سارتر، سیمون دی بووا، اندرے سخاروف اور متعدد دوسرے اہل قلم کی ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف مزاحمت نے انھیں اپنی حکومتوں اور عوام کی نگاہوں میں غدار ٹھہرایا۔ الجزائر کو فرانس سے آزادی دلانے کے لیے جو جدوجہد ہو رہی تھی اس نے باضمیر ادیبوں اور دانشوروں کو قاتلانہ حملوں کا نشانہ بنایا۔ اسی طرح ویت نام کی جنگ کے خلاف امریکا اور یورپ کے ادیبوں کی سخت مزاحمت نے رائے عامہ کو حکومت کے خلاف کر دیا اور بات وہاں تک پہنچی کہ امریکا کو ویت نام سے رخصت ہونا پڑا۔

ہم اگر دنیا کے نقشے کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بیسویں اور اکیسویں صدی کے آغاز سے دنیا بھر کے بیشتر ملکوں میں دانشوروں اور اہل قلم نے ظلم اور ناانصافی کے خلاف جم کر لڑائی لڑی ہے۔ آج ہمارے یہاں پُر جوش طلبا اپنے حق کے لیے سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ وہ یونین سازی کا اور آزادی اظہار کا حق مانگ رہے ہیں، جواباً ان سے کہا جا رہا ہے کہ یونیورسٹیاں تشدد کا گڑھ ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مشال خان جو یونیورسٹی انتظامیہ کی طرف سے بدترین تشدد کا نشانہ بنا، اس کی دادرسی کے بجائے طلبا کو تشدد کا محرک اور مرتکب قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ ہمارے سوچنے کی بات ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو ان کا حق دلانے کے لیے ان کے ساتھ کھڑے ہوں گے یا تماشائی کی طرح ان پر ہونے والے تشدد کو دیکھتے رہیں گے۔ (بشکریہ ایکسپریس)

بنیادی آزادیوں کے تحفظ کے لیے سوچ بچار

مقررین اظہارِ خیال کرتے ہوئے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے 24 اکتوبر کو اسلام آباد ہوٹل، اسلام آباد میں عوامی مقامات کی واگزاری" کے موضوع پر ایک سیمینار کا اہتمام کیا جس کے مقررین میں معروف صحافی مرتضیٰ سولنگی، قومی کمیشن برائے انسانی حقوق کی سابق چیئر پرسن خاور ممتاز؛ عورتوں اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق کی کارکن رومانہ بشیر، نامور صحافی اقبال خٹک؛ ڈیجیٹل حقوق کے کارکن شہزاد احمد اور ایڈووکیٹ حیدر امتیاز شامل تھے۔ شاعر، مضمون نگار اور ایچ آر سی پی کے سیکریٹری جنرل حارث خلیق نے سیمینار کی نظامت کی ذمہ داری نبھائی جبکہ ایچ آر سی پی کے اعزازی ترجمان اور انسانی حقوق کی ممتاز شخصیت آئی اے رحمان نے اختتامی خطبہ دیا۔

اپنے افتتاحی کلمات میں حارث خلیق نے کہا کہ آج کی تقریب اس ملک کے عوام کے حقوق پر غیر معمولی پابندیوں کا جائزہ لینے کے لیے منعقد کی گئی ہے۔ شہریوں کی تکالیف سے اقتدار کے ایوانوں کو مطلع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ضروری قوانین اور پالیسیاں متعارف ہوں اور لوگوں کو ریلیف ملے جس کی انہیں اشد ضرورت ہے اور ان کی آزادیوں کو محفوظ کیا جا سکے۔

ان کا کہنا تھا کہ جو جگہ ہم سے چھن گئی ہے اسے واگزار کیسے کریں؟ اور ہمیں آگے کس طرح بڑھنا ہے؟ ان معاملات کے حل کے لیے ہم نے یہ سیمینار منعقد کیا ہے تاکہ اس اجتماع سے کچھ سفارشات لی جائیں اور پھر ان پر عمل درآمد کے لیے سعی کی جائے۔

شہزاد احمد نے کہا کہ اظہار اور انجمن سازی کی آزادی کو ریاستی و غیر ریاستی، دونوں عناصر سے خطرہ ہے۔ ابھی حال ہی میں، خواتین کارکنوں نے سائبر اور ڈیجیٹل میدان میں آگے بڑھی ہی تھیں کہ انہیں سائبر افواج اور ٹرولز کے حملوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جنہوں نے عورتوں کے لیے مشکل بنا دیا ہے کہ وہ ڈیجیٹل میدان میں محفوظ طریقے سے سرگرم رہ سکیں اور اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کر سکیں۔

ان کا مزید کہنا تھا کہ ریاستی حکام، تجارتی کمپنیوں یہاں تک کہ سیاسی جماعتوں کے اپنے دستے ہیں جو اپنے مخالفین پر آن لائن حملے کرتے ہیں۔ ایسے دستے مستقل بنیادوں پر انسانی حقوق کے کارکنوں کے خلاف زہریلا اور نفرت انگیز پراپیگنڈہ کرتے ہیں اور ایسے عناصر کو ریاستی اداروں کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ ان کے خلاف کسی قسم کی قانونی کارروائی نہیں ہوتی۔ مذہبی اقلیتوں، صنفی اقلیتوں اور لسانی اقلیتوں کو اپنے مسائل اجاگر کرنے کے لیے ڈیجیٹل میڈیا کے استعمال میں بہت بڑی مشکلات کا سامنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ حکومت پاکستان میں انٹرنیٹ کے استعمال کو محدود کرنے اور اس پر نظر رکھنے کے لیے چینی ماڈل کی تقلید کرنا چاہتی۔ اس کے علاوہ، انہیں استعداد سے متعلقہ مسائل بھی درپیش ہیں اور اور ملک کے شہریوں کی آسانیوں کے لیے جدید آلات بروئے کار لانے کے قابل نہیں۔ 2006 سے سا؟ سبر اسپیس پابندیوں کی زد میں ہے۔ پہلے اس پر سلامتی کے نام پر پابندیاں لگائی گئیں، پھر مذہب کی تصحیک کو روکنے کے نام پر اور پھر سب سے آخر میں اخلاقیات کے تحفظ کے نام پر۔ شہری و سیاسی حقوق کا عالمی معاہدہ حکومت سے سائبر کرائم ایکٹ پر نظر ثانی کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ انسانی حقوق کی مرکزی دھارے کی تحریک کو ڈیجیٹل حقوق کے تحفظ کے لیے بھی آگے بڑھنا ہوگا۔

اقبال خٹک نے کہا کہ مرکزی میڈیا تقریباً ختم ہونے کے قریب ہے۔ نامور صحافی سوشل میڈیا کا رخ کر رہے ہیں جس وجہ سے حکام اب سوشل میڈیا کو کنٹرول کرنا چاہتے ہیں۔ دو برس قبل ہمیں ایسے ممالک کی فہرست دیکھنے کا موقع ملا جو ڈیجیٹل نشانات کے ذریعے انٹرنیٹ صارفین کا پتہ چلانے کا سافٹ وئیر خرید رہے تھے۔ اسے بڑے پیمانے پر کڑی نگرانی کا سافٹ وئیر کہا گیا۔ صحافیوں پر حملوں کی مانیٹرنگ کے دوران انہیں معلوم ہو کہ پاکستان میں صحافیوں کے لیے سب سے خطرناک جگہ اسلام آباد ہے جس کے بعد پنجاب ہے۔ خیبر پختونخوا میں صحافیوں کے لیے کوئی خطرات رپورٹ نہ ہوئے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خیبر پختونخوا میں کام کرنے والے صحافیوں نے سیلف سنسر شپ اختیار کر لی ہے۔ یہی صورت حال بلوچستان میں تھی۔ ہمیں ایک بڑا اتحاد بنانے اور مطالبات کا منشور مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

مرتضیٰ سولنگی نے کہا کہ چاہے اسٹیٹ (ریاستی) میڈیا ہو یا سیٹھ (نجی میڈیا) یہ ریاست کے جبری قوت کے کنٹرول میں ہے۔ کیا شائع ہونا ہے، یا دکھایا جانا ہے، یہاں تک کہ لکھاریوں اور اینکر پرسن کا انتخاب بھی گہری ریاست کرتی ہے۔ میڈیا کے ملازمین کی تنخواہیں تک یہ قوتیں طے کرتی ہیں۔

مثبت بات یہ ہے کہ مشکلات کے باوجود بعض لوگوں نے ملکی حالات کی اصل شکل عوام کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ سب کو پتہ ہے کہ یہ نظامِ پستی کون چلا رہا ہے۔ ریاست پر قابض طاقتوں کے خوف کی وجہ سے لوگ اپنی آواز بلند کرنے سے گریزاں ہیں۔ ایک دن ان کا تسلط زمین بوس ہو جائے گا۔ بدقسمتی سے، ہماری سیاسی جماعتوں کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ انہیں لوگوں کی بنیادی آزادیوں کی بحالی کی ذمہ داری نبھانی ہوگی۔ سول سوسائٹی اور صحافیوں اپنے طور پر تن تنہا اتنا بڑا نہیں کر سکتے۔ ہمیں یقین ہے کہ صورت حال ہمیشہ ایسی نہیں رہے گی۔ ایک دن پاکستان حقیقی تبدیلی دیکھے گا۔ لوگوں کو درست معلومات لینے کا حق حاصل ہے۔ ذرائع ابلاغ پر اس حق کے تحفظ کی ذمہ داری عائد ہے۔ عوام کو چاہیے

کہ وہ عوامی صحافت کی مدد کریں۔

ایک جمہوری ملک میں ملک کا آئین بنیادی آزادیوں بشمول اظہار اور اجتماع کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے اور ریاستیں اس آئین کے اطلاق کے لیے آئینی وقانونی ڈھانچہ تشکیل دیتی ہے۔ آئین کے آرٹیکل 199 اور 184 سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کو آئین میں درج بنیادی حقوق کے تحفظ کا اختیار دیتا ہے۔ کیا وہ حقوق محفوظ ہیں یا کیا عدالتیں آزاد ہیں؟ جواب نفی میں ہے۔ گہری ریاست کی نظامِ انصاف میں مداخلت ایک کھلا راز بن چکا ہے۔ کچھ طاقتیں حزب اختلاف کے رہنماؤں کے خلاف مقدمات کی کارروائیوں پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔ رانا ثنااللہ کے مقدمے کی سماعت کرنے والے ایک جج کو واٹس ایپ میسج کے ذریعے ہٹا دیا جاتا ہے جس کے بعد کوئی بھی مستقل جج تعینات نہیں کیا گیا۔ اس مقدمے کی کارروائی میں کھلی مداخلت عدالتوں پر اثر کی عکاسی کرتی ہے۔ آئین کے آرٹیکل 06 کے تحت پرویز مشرف کے خلاف آئین توڑنے کا ایک مقدمہ چل رہا تھا جس کی سماعت ایک خصوصی عدالت میں ہو رہی تھی۔ عدالت کے پاس پچھلے 06 برسوں میں یہی ایک مقدمہ تھا جو وہ ابھی تک نبٹا نہیں سکی۔ استغاثہ شہادتیں پیش ہوئے پانچ بیت گئے ہیں۔ مگر پانچ برس گزرنے کے باوجود ہم نے فیصلہ نہیں دیکھا۔ اور بالآخر جب اسغاثہ ٹیم تمام تحریری دلائل دے چکی تو کل اسے مقدمے کی پیروی سے ہٹا دیا گیا ہے اور اب وہ مقدمے میں وفاق کی نمائندہ نہیں رہی۔ ایسی اطلاعات بھی تھیں کہ ججوں کو ان کے چیمبرز میں ملا جاتا ہے، ججوں کے خلاف ریفرینسز دائر کیے جاتے ہیں تاکہ وہ حکام کی اطاعت قبول کرلیں اور پراسیکیوٹرز کو ہٹایا جاتا ہے۔ ہر سطح پر اتحاد اور خلاف ورزیوں اور مداخلتوں اور دباؤ کی مثالوں کو رقم کرنے سے ہی ہم کچھ رفت کر سکتے ہیں۔

رومانہ بشیر نے کہا کہ ملک میں مذہبی اقلیتوں کی حالت بہت تشویش ناک ہے۔ جب بھی وہ اپنے حقوق کے لیے بولتے ہیں انہیں مغرب کا ایجنٹ کہا جاتا ہے اور مذہب کے نام پر انہیں نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر رمیش نے بچوں کی شادی پر قانون کا مسودہ متعارف کروایا تو ان کی اپنی سیاسی جماعت کے رکن نے انہیں آلیا اور کہا کہ چونکہ محترم رمیش اقلیت سے ہیں وہ انسانی حقوق پر بات نہیں کر سکتے۔ ایوارڈز کالج پشاور کے پرنسپل کو دھمکایا گیا ہے۔ ان کے گھر کا محاصرہ کیا گیا۔ ریاست بعض عناصر کے ساتھ ساز باز کر کے گھر کی اراضی ہتھیانا چاہتی ہے۔ گولڑہ، اسلام آباد میں کچھ مسیحی لوگ اپنے گھر میں عبادت کر رہے تھے کہ اس دوران چند مسلمانوں نے ان پر حملہ کر دیا اور انہیں ان کے گھر سے بے دخل کر دیا۔ حملہ آور ان کے گھر پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ ان حالات میں آپ انسانی حقوق کے لیے کیسے بول سکتے ہیں؟ رومانہ بشیر نے سوال کیا۔ نچلے طبقے کے اقلیتی افراد کو اپنی روزی روٹی کا بندوبست کرنے کے لیے نچلی درجے کی ملازمتیں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔

خاور ممتاز نے شرکاء سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ وہ جاننا چاہتی ہیں کہ آزادیوں پر پابندیوں کی وجوہ کیا ہیں۔ اگر یہ سلامتی کے نام پر عائد ہیں تو پھر شہریوں کی سلامتی اور زندگی داؤ پر کیوں لگی ہوئی ہے۔ لوگوں کو خاموش کیوں کروایا جا رہا ہے۔ موجودہ حالات جنرل ضیاء کے حالات سے بھی برے ہیں۔ سرکاری حکام نے کئی کمیونٹی تنظیموں کو بند کر دیا ہے۔ اس ملک میں جمہوریت کا فقدان ہے۔ یہاں تک کہ سیاسی جماعتوں کے اندر بھی جمہوریت نہیں ہے۔ مساوی شہریت کا بیانیہ غائب ہو گیا ہے۔ ہمیں اس بیانیے کو مرکزی دھارے میں واپس لانے کی ضرورت ہے۔ ریاست کو اس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے اتحاد بنانے ضروری ہیں۔ ایک دفعہ ہم نے این جی اوز فورم بنایا تھا جس میں کوئی 3000 این جی اوز شامل تھیں۔ زیادہ تر چھوٹی تنظیمیں تھیں۔ ہمیں اپنی آواز بلند رکھنا ہوگی۔ عوام کو دیوار کے ساتھ لگا کر کس کو کیا مل رہا ہے۔ اس کا لوگوں کی زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ اس سب کچھ کو قلمبند کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں لوگوں کے حالات وواقعات کو بھی قلمبند کرنے کی ضرورت ہے۔

سیمینار کے شرکاء

> ملک میں مذہبی اقلیتوں کی حالت بہت تشویش ناک ہے۔ جب بھی وہ اپنے حقوق کے لیے بولتے ہیں انہیں مغرب کا ایجنٹ کہا جاتا ہے اور مذہب کے نام پر انہیں نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر رمیش نے بچوں کی شادی پر قانون کا مسودہ متعارف کروایا تو ان کی اپنی سیاسی جماعت کے رکن نے انہیں آلیا اور کہا کہ چونکہ محترم رمیش اقلیت سے ہیں وہ انسانی حقوق پر بات نہیں کر سکتے۔ ایوارڈز کالج پشاور کے پرنسپل کو دھمکایا گیا ہے۔ ان کے گھر کا محاصرہ کیا گیا۔ ریاست بعض عناصر کے ساتھ ساز باز کر کے گھر کی اراضی ہتھیانا چاہتی ہے۔ گولڑہ، اسلام آباد میں کچھ مسیحی لوگ اپنے گھر میں عبادت کر رہے تھے کہ اس دوران چند مسلمانوں نے ان پر حملہ کر دیا اور انہیں ان کے گھر سے بے دخل کر دیا۔

فرحت اللہ بابر کا کہنا تھا کہ شہری آزادیوں پر مکالمے کے لیے چند مخلص کارکنوں کی ضرورت ہے۔ اس سے سیاسی جماعتوں کو ترغیب ملے گی کہ وہ اپنی پالیسیوں میں انسانی حقوق کا بیانیہ بھی شامل کریں۔ فوجی فاؤنڈیشن، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن اس وقت پاکستان کی بڑی تجارتی کمپنیوں میں شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ملک میں معاشی جگہ بھی فوجی نوکر شاہی نے قبضے میں لے لی ہے۔

طاہرہ حبیب کا کہنا تھا کہ معاشرے میں عورتوں کے خلاف نفرت انسانی حقوق کے کارکنوں کے لیے پریشانی کا سبب ہے۔ اس سے بھی تشویشناک بات یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ خواتین کارکنوں کے خلاف پراپیگنڈہ پھیلانے میں کردار ادا کر رہے ہیں اور ان دولت مند طبقے کی عورتیں، لبرل عورتیں اور این جی اوز کے ساتھ وابستہ عورتوں کے لیبل لگا کر عوام میں ان کا منفی تشخص پیدا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ، مذہبی اقلیتوں کے خلاف درسی کتابوں میں نفرت انگیز مواد ہے جو بچوں کو پڑھایا جاتا ہے اور ان کے دلوں میں پاکستان کے غیر مسلم شہریوں کے لیے کدورت پیدا کی جاتی ہے۔

سیمینار کی بحث کو سمیٹتے ہوئے آئی اے رحمان نے کہا کہ چند برس قبل انہوں نے سوچا تھا کہ نئے آلات سنسر شپ کی راہ میں حائل ہوں گے۔ اس کے برعکس، 9/11 کے بعد ہم نے مشاہدہ کیا کہ سنسر شپ واپس آ گئی ہے اور وہی آلات جن سے ہم نے بہتری کی امیدیں لگائی تھیں اظہار کی آزادی کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔ حکومت کبھی بھی اپنے معاملات کو رازداری سے انجام دینے اور دیوالیہ پن کا شکار نہیں رہی۔ آج جو سنسر شپ ہم دیکھ رہے ہیں وہ سماج کے لیے اس سے زیادہ تباہ کن ہے جو ہم نے ماضی میں دیکھی تھی۔ معاشرے میں گروہ بندی کا عمل تیز ہو رہا ہے۔ قانونی برادری اور صحافیوں کی صفوں میں پھوٹ پیدا کی جا رہی ہے تاکہ وہ اپنے حق کے لیے قانونی جنگ لڑنے سے باز رہیں۔ صرف اجتماعی کوششوں اور غیر متزلزل عزم سے ہی ہم کچھ بہتری لا سکتے ہیں۔

سندھ: تعلیمی نصاب میں خواتین کا کردار گھر کے کام کاج تک محدود

کراچی پاکستان کے صوبہ سندھ کے پرائمری اور سیکنڈری نصاب تعلیم میں خواتین کے بارے میں متعصب مواد پایا جاتا ہے جس میں مردوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے جبکہ خواتین کا کردار گھر کے کام کاج تک محدود رکھا گیا ہے۔

یہ نتیجہ سندھ کی شاہ عبدالطیف یونیورسٹی کی جانب سے سندھی نصابی کتابوں میں صنفی نمائندگی اور شناخت پر تحقیق سے اخذ کیا گیا ہے۔

یہ تحقیق شاہ عبدالطیف یونیورسٹی کے شعبہ سوشیالوجی کی ڈاکٹر نادیہ آغا، پروفیسر غزل کاظم اور دیدار میرانی نے کی ہے۔

ڈاکٹر نادیہ آغا نے بی بی سی کو بتایا کہ یہ تحقیق دو حصوں میں کی گئی ہے۔

پہلے مرحلے میں پرائمری سطح کے نصاب کا جائزہ لیا گیا جبکہ دوسرے مرحلے میں سیکینڈری نصاب کا تجزیہ کیا گیا۔

ان کا کہنا تھا: 'ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اس نصاب میں صنفی نمائندگی کیسے کی گئی ہے۔ اس کے لیے نصاب میں موجود تصاویر اور مواد کا تجزیہ کیا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ نصاب پدرانہ نظام کو (جس میں گھر کا سربراہ مرد ہوتا ہے) سپورٹ کرتا ہے۔'

عورتوں کا کردار گھریلو کام کاج تک محدود

ڈاکٹر نادیہ کے مطابق سندھی نصابی کتابوں میں عورتوں کو یا تو گھر کا کام کاج کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے یا اگر وہ سکول بھی جاتی ہیں تو وہاں بھی جو تعلیم دی جاتی ہے وہ گھر کے کام کاج کے بارے میں ہی ہوتی ہے۔

اس میں دکھایا گیا ہے کہ سکول سے واپسی پر لڑکا بیٹھ جاتا ہے اور لڑکی اسے پانی لا کر دیتی ہے، اس کی خدمت کرتی ہے۔ ماں نے کھانا بنایا ہوا ہے تو وہ کھانا لے کر جاتی ہے۔ شام میں لڑکا کھیلنے چلا جاتا ہے جبکہ لڑکی گھر میں بیٹھ کر ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔

تحقیق میں پہلی جماعت کے خاندان کے بارے میں مضمون کو زیر بحث لایا گیا ہے جس میں والد کے کام کاج کے بارے میں تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ جبکہ ماں کا کردار گھریلو کام کاج تک محدود ہے کہ وہ ناشتہ بناتی ہے، گھر کی صفائی کرتی، پھر دوپہر کا کھانا بناتی ہے۔

تحقیق میں تبصرہ کیا گیا ہے اس صورتحال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گھر کا کام کاج صرف عورت کی ہی ذمہ داری ہے۔

اسی طرح تیسری جماعت کے سبق میں دو اچھی لڑکیوں، نوری اور شبنم، کا حوالہ دیا گیا ہے کہ وہ کبھی فارغ نہیں بیٹھتی:

سلائی کڑھائی کرتی ہیں، برتن اور کپڑے دھوتی ہیں اور دیگر لڑکیوں کے ہمراہ اپنی کلاس کی بھی صفائی کرتی ہیں۔

تیسری جماعت کے پانی پر سبق میں تین تصاویر دی گئی ہیں جن میں ایک میں مرد استاد اور طالبعلم پانی ذخیرہ کرنے پر بات کر رہے ہیں۔ دیگر دو تصاویر میں کنویں اور جھیلوں میں پانی جمع ہونے کے بارے میں دکھایا گیا ہے۔ جبکہ ان میں خواتین پانی نکالتے یا پھر لے جاتے ہوئے نظر آتی ہیں۔

لڑکیوں کے لیے تعلیم اور صحت کے شعبے

سندھ کے محکمہ تعلیم کے اعداد و شمار کے مطابق سرکاری سکولوں میں صرف 39 فیصد لڑکیاں ہیں۔ اسی طرح ان بچوں کو پڑھانے والے اساتذہ کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہے جن میں 31 فیصد خواتین ٹیچرز ہیں۔

ڈاکٹر نادیہ آغا کا کہنا تھا کہ سکول میں جب مستقبل کا پروفیشن منتخب کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو سائنس اور انجینئرنگ کے شعبوں کی طرف لڑکوں کا رجحان زیادہ دکھایا جاتا ہے جبکہ لڑکیوں کو صحت، ٹیچنگ یا نرسنگ کی طرف راغب دکھایا جاتا ہے: 'جو گھر کے کام کرنے والے کردار ہیں ان میں عورت کو فٹ کیا گیا ہے اور جو پیداواری کام ہیں اس میں لڑکوں کو کردار دیا گیا ہے۔'

اس تحقیق کے مطابق سندھی کے علاوہ انگریزی اور پاکستان سٹڈیز کے مضامین میں بھی صنفی برابری نہیں۔ پنجاب، خیبر پختونخواہ اور بلوچستان میں بھی کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔

ڈاکٹر نادیہ آغا کے مطابق ہماری عوامی اور تاریخی شخصیات کے بارے میں مضامین میں بھی مردوں کا ذکر زیادہ ہے۔ جبکہ خواتین کا ذکر شاذ و نادر ہی کیا جاتا ہے، حالانکہ عام زندگی میں ان کے بھی حوالے دیئے جاتے ہیں۔

زیر تعلیم بچوں کے ذہنوں پر اثرات کی تعداد اب بھی لڑکوں سے کم ہے

یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی میں جینڈر سٹڈیز کے شعبے کی سربراہ ڈاکٹر امبرین صلاح الدین کا کہنا ہے کہ جب گھر کے ماحول سے نکل کر بچہ پہلی مرتبہ سکول آتا ہے تو اس کے لیے استاد یا استانی اور وہ کتاب جس سے اس کا تعارف ہو رہا ہے بہت اہم ہیں اور اس کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔

ان کے بقول نصاب میں سماجی کردار کا تعین کیا جاتا ہے۔ جیسے ہماری اردو کی کتاب میں ہے حامد اور ثریا بھائی بہن ہیں۔ سکول سے واپس آئے تو ثریا نے بستہ رکھا اور ماں کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹانے چلی گئی۔ جبکہ حامد نے بستہ رکھا اور بچوں کے ساتھ کھیلنے باہر چلا گیا۔ اس سے یہ واضح ہے کہ لڑکی نے گھر کا کام کرنا ہے اور لڑکے کا ان کاموں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ذہنوں میں اثر چھوڑتے ہیں کہ ہاں یہ ہمارا کردار ہے۔

ڈاکٹر نادیہ آغا کا کہنا ہے کہ نصابی کتب میں موجود مواد ہی ٹیچرز پڑھاتے ہیں اور بچے سمجھتے ہیں کہ یہ ہی حقیقت ہے۔ ان کے بقول اس سے مرد اور عورت کے روایتی کردار کا تسلسل جاری رہتا ہے اور لوگ اس پر سوال اٹھانے کی بجائے اسے قبول کر لیتے جس سے پدرانہ نظام کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔

نصاب کی تشکیل میں عدم توازن

پاکستان میں اس وقت چاروں صوبوں کے علاوہ وفاقی تعلیمی بورڈ، آغا خان تعلیمی بورڈ اور کیمبرج بورڈ کا نصاب رائج ہے۔ بچوں کی اکثریت سرکاری اسکولوں میں زیر تعلیم ہے۔

ڈاکٹر امبرین کا کہنا ہے کہ نصاب ترتیب دیتے وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ ترتیب دینے والے کون لوگ ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے کاموں میں صنفی برابری نہیں ہوتی اور انہیں قوی یقین ہے کہ جب نصاب کی تشکیل ہوتی ہے تو اس میں زیادہ تر مرد حضرات ہی ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر نادیہ آغا کا کہنا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ جو تبدیلیاں آئی ہیں ان کو نصاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے وہ اس تحقیق کے ذریعے پالیسی سازوں کو بتانا چاہتی ہیں کہ وہ نصاب پر نظر ثانی کریں کیونکہ اس سے تبدیلی نہیں آ رہی بلکہ اس سے ماحول زیادہ خراب ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر امبرین کا مشورہ ہے کہ نصاب کی تشکیل کرنے والوں میں انسانی حقوق، صنفی برابری، قانون اور مذہب کا علم رکھنے والوں کو شامل کرنا چاہیے۔

(بشکریہ بی بی سی اردو)

لاپتہ افراد کا ریکارڈ مرتب کرنے والا خود لاپتہ

انسانی حقوق کے کارکن ادریس خٹک کی مبینہ 'جبری گمشدگی' پر پاکستان کی سول سوسائٹی اور سیاسی رہنماؤں نے سخت تشویش کا اظہار کیا ہے۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ ان کی بازیابی کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں۔

ادریس خٹک سیاسی طور پر ایک نیشنل پارٹی سے وابستہ ہیں جبکہ وہ ایمنسٹی انٹرنیشنل میں بھی کام کر چکے ہیں۔ ان کے قریبی ذرائع کے مطابق وہ جبری طور پر گمشدہ ہونے والے افراد کا ریکارڈ مرتب کر رہے تھے۔ انہیں تقریباً چھ دن پہلے صوابی انٹرچینج سے نامعلوم افراد نے ڈرائیور سمیت اٹھا لیا تھا۔ ان کے قریبی ذرائع کے مطابق ان کے ڈرائیور کو بعد میں رہا کر دیا گیا لیکن وہ اب بھی لاپتہ ہیں۔

ان کی مبینہ 'جبری گمشدگی' پر سیاسی اور سماجی حلقوں میں سخت تشویش پائی جاتی ہے جب کہ سوشل میڈیا پر بھی ان کی 'جبری گمشدگی' پر تبصرے کے جا رہے ہیں۔ سابق رکن قومی اسمبلی بشریٰ گوہر نے اس واقعے کی مذمت کرتے ہوئے ڈی ڈبلیو کو بتایا، "یہ بڑا خطرناک رجحان ہے کہ ریاست اختلافی آوازوں کو دبا رہی ہے اور سیاسی مخالفین کو خاموش کرا رہی ہے جب کہ ہزاروں انسانوں کے قاتل طالبان کو پروٹوکول دیا جا رہا ہے اور ان کو خیبر پختونخوا میں کام کرنے کی کھلی آزادی دی جا رہی ہے۔ ادریس خٹک کو مبینہ طور پر قانون نافذ کرنے والے اداروں نے اٹھایا ہے اور ستم یہ ہے کہ آخری اطلاعات تک اغوا کاروں کے خلاف ایف آئی آر بھی نہیں کاٹی جا رہی تھی۔'' انہوں نے الزام عائد کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ پاکستانی حکومت انسانی حقوق اور سیاسی کارکنوں کی آوازیں دبانے کا سلسلہ بند کرے اور ادریس کو فوری طور پر بازیاب کرائے، "پارلیمنٹ کی انسانی حقوق کی کمیٹی اور یو این کے ہیومن رائٹس کمیشن کو اس کا فوری نوٹس لینا چاہیے۔ لوگوں کو اغوا کرنے کے سلسلے کو فوری طور پر بند کیا جانا چاہیے۔''

پاکستان میں جبری گمشدگی کے معاملے کو کئی حلقے سنگین قرار دیتے ہیں۔ ابتدائی طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ بلوچ علیحدگی پسندوں اور طالبان عسکریت پسندوں کی ایک بڑی تعداد ایسے گمشدہ افراد میں شامل ہے۔ لیکن اب ناقدین کا دعوی ہے کہ اس میں سیاسی کارکنان اور سول سوسائٹی کے ارکان بھی شامل ہیں۔ ایم کیو ایم کا دعوی ہے کہ اس کے ایک سو پچاس کے قریب کارکنان جبری طور پر لاپتہ ہیں۔ جب کہ جئے سندھ، شیعہ جماعتیں اور دوسری مذہبی و سیاسی تنظیمیں بھی ایسی ہی شکایات کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جبری گمشدگی کے اس بڑھتے ہوئے رجحان پر سیاست دان پریشان نظر آتے ہیں اور ان کا دعوی ہے کہ اب عام شہریوں کو بھی اس غیر انسانی عمل کا شکار بنایا جا رہا ہے۔

سابق وفاقی وزیر برائے جہاز رانی و بندرگاہ میر حاصل بزنجو کا کہنا ہے کہ ان کی پارٹی اس مسئلے پر خاموش نہیں رہے گی، "میں ذاتی طور پر ادریس خٹک کو جانتا ہوں۔ وہ ایک انتہائی شریف انسان ہے لیکن فرض کر بھی لیں کہ اس نے کوئی جرم کیا ہے تو آپ اس کو عدالت میں پیش کریں۔ ہم ادریس سمیت جبری طور پر لاپتہ کیے گئے افراد کے معاملے کو عدالتوں اور پارلیمنٹ سمیت ہر فورم پر اٹھائیں گے۔ اس سے ملک کے بدنامی ہو رہی ہے کیونکہ دنیا کے کسی بھی مہذب ملک میں اس طرح شہریوں کو نہیں اٹھایا جاتا۔''

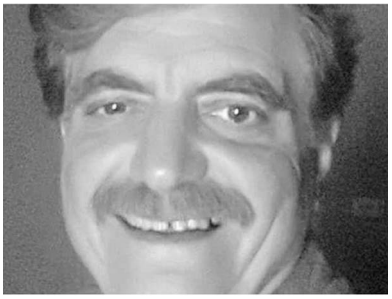

فارمین کرسچین کالج یونیورسٹی لاہور سے تعلق رکھنے والے تجزیہ نگار عمار علی جان کا کہنا ہے کہ ریاست کنفیوژن کا شکار ہے، "انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والے ارکان مشکل میں ہیں۔ ان کے لئے پاکستان میں کام کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ سیاسی کارکنان کے لئے بھی مشکلات بڑھ رہی ہیں۔'' اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے تجزیہ نگار ایوب ملک کا خیال ہے کہ اگر ادریس خٹک کو فوری طور پر بازیاب نہیں کرایا گیا تو مخالفین پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ مزید شدید کریں گے، "ہم کس منہ سے کسی اور ملک میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا رونا روئیں گے اگر ہمارے اپنے ملک میں ایسے واقعات ہو رہے ہوں۔ ادریس خٹک کا انسانی حقوق کی تنظیموں اور سول سوسائٹی میں بڑا احترام ہے۔ سوشل میڈیا ان کی گمشدگی پر سراپا احتجاج بنا ہوا ہے۔ کئی نامور شخصیات نے بھی ان کے لئے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ایسے میں اگر حکومت نے ہوش کے ناخن نہ لئے تو پھر ہمارے لئے مسائل مزید بڑھیں گے۔''

ڈی ڈبلیو نے اس حوالے سے حکومتی ذمہ داروں سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے فون نہیں اٹھایا۔

جہد حق پڑھنے والے توجہ کریں

- آپ نے اس شمارہ کا مطالعہ کیا۔

جو خامیاں / کمزوریاں آپ کو نظر آئی ہوں۔ ان کی نشاندہی خط کے ذریعے سے کیجئے۔

- آپ بھی اپنے علاقے میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی رپورٹ / اطلاع ہمیں اس رسالہ میں چھپنے والا رپورٹ فارم پُر کر کے بذریعہ ڈاک روانہ کر سکتے ہیں۔ حقائق اچھی طرح سے تصدیق کر کے لکھیں۔

HRCP کارکن متوجہ ہوں

''جہد حق'' کے لیے رپورٹ فارم کے مطابق کوائف پر مبنی رپورٹیں، خبریں، تصاویر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق دیگر مواد مہینے کے تیسرے ہفتہ تک پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مرکزی دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تاکہ یہ اگلے شمارے میں شائع کیا جا سکے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک،

نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

جہد حق کا تازہ شمارہ اور پچھلے شمارے نیچے دی گئی ویب سائٹ پر موجود ہیں

www.hrcp-web.org

"انجمن سازی کی آزادی پر اعلانیہ وغیر اعلانیہ پابندیاں ہیں"

عروسہ شوکت

شاعر، لکھاری اور اس وقت پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے سیکرٹری جنرل حارث خلیق سے گفتگو۔

دی نیوز آن سنڈے (ٹی این ایس) پاکستان جمہوریت کیسے بامعنی ہے؟ کیا عوام اب بھی جمہوری نظام اور اس کے سیاسی اجزاء کے ساتھ اپنی جڑت محسوس کرتے ہیں یا بداعتمادی نے گھر کر لیا ہے؟

حارث خلیق (ح خ): گذشتہ کچھ برسوں میں پاکستان نوزائیدہ جمہوری ملک سے نیم جمہوری ملک میں تبدیل ہوا ہے۔ 'عوام' ایک کھلی چوڑی اصطلاح ہے۔ مختلف طبقے اور لسانی شناختیں، گروہی و ادارہ جاتی خواہشات، مختلف آراء اور مقابل مفادات اِس کا حصہ ہیں۔

جمہوریت ایک اجتماعی راستے اور اجتماعی آواز تک پہنچنے کے لیے مختلف گروہوں اور ان کے تحفظات کے مابین مکالمے کا نام ہے۔ ونسٹن چرچل نے غالباً اپنے ایک پیشرو کا قول بیان کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ میری عاجز رائے یہ ہے کہ لوگوں کے مابین حقوق اور آزادیوں پر مذاکرات کا عمل جو مشترکہ فیصلوں پر پہنچ سکے، ایک حقیقی جمہوری نظام کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے، آج ہمارے سامنے سوال یہ نہیں کہ لوگوں کو مجموعی طور پر جمہوریت پر بھروسہ ہے کہ نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ ہماری معیشت و سیاست پر براجمان ادارے اور طبقے جمہوریت کو ایک مناسب موقع دینے میں مخلص ہیں کہ نہیں۔ چند افراد مخلص بھی ہو سکتے ہیں مگر پاکستان کا دولت مند، تعلیم یافتہ شہری متوسط طبقہ فطری طور پر غیر جمہوری ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ وہ اقلیت میں ہیں اور ان مسائل فی الفور انتظامی حل چاہتے ہیں جنہیں سیاسی طریقے سے حل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ طبقہ اور اس کی سوچ کو — تاریخ سے سیاست سے نابلد — ریاست کے مستقل اداروں (سول اور فوجی) اور ذرائع ابلاغ اور سروسز کے شعبوں میں فیصلہ سازی کے عمل میں بہت زیادہ عمل دخل ہے۔

حارث خلیق (ح خ)

ٹی این ایس: موجودہ ماحول میں سیاسی کارکنوں اور جماعتوں کو کام کرنے کی کس حد تک آزادی ہے؟ یہ تاثر کیوں عام ہے کہ سیاسی سرگرمیوں کے لیے زمین بہت زرخیز ادہ تنگ ہوگئی ہے؟

(ح خ) تحریک انصاف کے حامیوں کی چونکہ یادداشت بہت کمزور ہے اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ احتساب کا

عمل جس پر اُن کا قائد کمربستہ ہے پاکستان میں نئی چیز ہے۔ پی ٹی آئی اور اس کے اتحادی انتظام پرور ہیں اور حزب اختلاف سے اس طرح پیش آ رہے ہیں جس طرح 1960 کی دہائی میں ایوب خان، 1970 کی دہائی میں زیڈ اے بھٹو، 1980 کی دہائی میں جنرل ضیاء الحق، 1990 کی دہائی میں پی ایم ایل-این اور پی پی پی اور 1999 سے 2007 کے درمیان جنرل پرویز مشرف پیش آئے تھے۔ جہاں تک سیاسی انتظام کا تعلق ہے تو 2008 سے 2018 کے درمیان ہمیں نسبتاً اچھا دور ملا تھا ماسوائے مختصر مدت کے لیے پی پی پی کی طرف سے پنجاب میں گورنر راج کا نفاذ اور پی ایم ایل-این کی طرف سے پی پی پی کے خلاف میموگیٹ اسکینڈل کے۔

آج یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اگر آپ ٹی ٹی آئی کی صفوں میں شامل ہو جائیں تو پھر آپ احتساب کی مہم سے بچ جائیں گے جس کا ہدف واضح طور حزبِ اختلاف کے سیاستدان ہیں۔ اس کے علاوہ، انجمن سازی اور اظہار کی آزادی اعلانیہ و غیر اعلانیہ پابندیوں کی زد میں ہے۔ اس سب کچھ کے نتیجے میں سیاسی فضا تنگ ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ عقل سے کام لیا جائے گا بصورت دیگر صورتحال اور زیادہ ابتر ہوگی۔

کیا برسرِ اقتدار سیاسی جماعتیں شہریوں کے مسائل کا مناسب مداوا کر رہی ہیں یا اس کی بجائے وہ اپنے سیاسی مخالفین کو بُرا ثابت کر کے اپنی سیاسی طاقت مستحکم کرنے میں مشغول ہیں۔

ٹی این ایس: مقامی حکومت کے نظام کے تسلسل کو یقینی بنانے کے لیے کوئی کوشش نظر نہیں آئی۔ فعال مقامی حکومتیں لوگوں کو کیا دے سکتی ہیں اور وہ ابھی تک عوام کی خدمت میں کامیاب کیوں نہیں ہو سکیں؟

ح خ: مقامی ادارے اُن فیصلوں میں عوام کے شرکت کے لیے ضروری ہیں جو اُن کی زندگی کو براہ راست متاثر کرتے ہیں۔ صوبائی و قومی سطح کے سیاستدانوں کو یہ خوف لاحق ہے کہ مقامی حکومت کے ادارے نہ صرے وسائل پر ان کا کنٹرول ختم کر دیں گے بلکہ وہ صوبائی و وفاقی سطح پر ہونے والے سیاسی عمل کی مخالفت کی استعداد بھی رکھتے ہیں۔ چونکہ تمام فوجی حکمرانوں نے منتخب اسمبلیاں برخواست کیں اور مقامی حکومت کے اداروں پر توجہ دی اِس لیے سیاسی لحاظ سے مقامی اداروں کی قبولیت محدود رہی ہے۔ مقامی حکومتوں سے سیاستدانوں کا خوف صرف اس صورت میں ختم ہو سکتا ہے اگر بغیر کسی مداخلت کے عام انتخابات کا تسلسل اور پارلیمان و صوبائی اسمبلیوں کے ترقیاتی فنڈز جاری رہیں جو کہ ضیاء الحق یا ان کی چُنی ہوئی پارلیمان نے متعارف کروائے تھے مگر بدقسمتی سے اُس وقت سے تمام حکومتوں نے جاری رکھے ہیں۔

ٹی این ایس: کیا برسرِ اقتدار سیاسی جماعتیں شہریوں کے مسائل کا مناسب مداوا کر رہی ہیں یا اس کی بجائے وہ اپنے سیاسی مخالفین کو بُرا ثابت کر کے اپنی سیاسی طاقت مستحکم کرنے میں مشغول ہیں۔

ح خ: شہریوں کے مسائل صرف اسی صورت حل ہو سکتے ہیں اور بنیادی شہری حقوق صرف اس صورت مل سکتے ہیں جب فعال اور جائز مقامی حکومتوں کو نظام موجود ہوگا۔ سیاسی جماعتوں کو یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے کہا، یہ سمجھ بوجھ ہمارے سیاسی ماضی سے الگ نہیں ہو سکتی۔

ٹی این ایس: تاریخی لحاظ سے، برسراقتدار جماعتیں بڑے معاملات پر حزب اختلاف سے اتفاقِ رائے قائم کرنے کا دعویٰ کرتی نظر آئی ہیں۔ وہ کوشش، چاہے بعض اوقات غیر مخلص ہی تھی، اب غائب ہوتی نظر آ رہی ہے اور اس کی جگہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ زیادہ مضبوط اتفاقِ رائے کا تاثر بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

ح خ: کچھ حد تک ایسا ہی ہے۔ یہ پہلے سے زیادہ واضح شکل میں ہے۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ ذیڈ اے بھٹو نے 1970 میں، نواز شریف نے 1990 میں اور عمران خان نے 2018 میں اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ گٹھ جوڑ بنایا۔ فرق یہ ہے کہ خان کو کسی بھی ایسے کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں شدید مشکل درپیش ہے جس کا مختلف نقطہ نظر ہے۔ جب معیشت کو سنبھالنے کی بات آتی ہے تو پھر اُن کی سیاسی جماعت کی

نااہلیت کے علاوہ، اُن کی خود ساختہ پارسائی بھی ان کی درست سیاسی فیصلہ لینے سے روکتی ہے۔

ٹی این ایس: اس صورت حال نے سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی کے مابین میل ملاپ کو کیسے متاثر کیا ہے؟

ح خ: جبر کا شکار ہر سیاسی جماعت سول سوسائٹی کے قریب آتی ہے۔ اس لیے، آپ دیکھیں گے کے حزبِ اقتدار سے زیادہ حزبِ اختلاف کی جماعتیں ہمیشہ سول سوسائٹی خاص طور پر انسانی حقوق کی تنظیموں اور آزاد ذرائع ابلاغ سے رجوع کریں گے اور انہیں سُنیں گی۔

میڈیا جس نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں

صحافی، محمد بدر عالم

پاکستانی نیوز میڈیا کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ اس کی روح نکال لی گئی ہے جبکہ ظاہری شکل و شباہت، اگر مکمل نہیں تو زیادہ تر اپنی جگہ پر جوں کی توں موجود ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ملک میں 35 سے زیادہ نیوز چینل ہیں جن کے سامعین کی تعداد ایک دوسرے سے مختلف ہے؛ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ پاکستان بھر

میں ہزاروں اخبارات، جریدے، اور رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ خبروں کی متعدد ویب سائٹس بھی سامنے آ رہی ہیں اور کئی سینئر اور بے روزگار صحافی اپنے سوشل میڈیا چینل کھول رہے ہیں۔ ہاں، چند ایک چھوٹے ٹی وی چینل بند ہوئے ہیں اور کئی دوسروں کو اپنا کام جاری رکھنے میں مشقت کرنی پڑ رہی ہے؛ ہاں، اخبارات کی ترسیل ملک بھر میں کم ہو رہی اور کئی اشاعتی اداروں کو بند ہونے پر مجبور کیا گیا ہے؛ اور ہاں، نیوز ویب سائٹس اور صحافیوں کے سوشل میڈیا پیلٹ فارموں کو وزٹ کرنے والے سامعین کی تعداد کم ہے۔ مگر مجموعی طور پر پاکستان میں ذرائع ابلاغ ابھی بھی ہزاروں لوگوں کو بھرتی کر رہے ہیں اور ہر روز کروڑوں روپے کے کاروبار کا حصہ ہیں۔

اس کے باوجود، ذرائع ابلاغ کے اس لمبے چوڑے نیٹ ورک کے نتائج نہایت بیاثر اور غیر اہم ہیں۔ تحقیقاتی صحافت دم توڑ چکی ہے۔ بیانات کی صحافت نے سیاسی گالی گلوچ کو جنم دینا شروع کر دیا ہے جو کہ ناشائستگی، بغض اور الزام تراشی جس نے ہمارے سیاست اور معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے کی شدت دلخراش اظہار نہ بھی ہو تو مضحکہ خیز ضرور ہے۔ آپ کو کسی بھی نیوز پیلٹ فارم پر بمشکل ہی کوئی اچھا انٹرویو ملے گا اور ڈیجیٹل میڈیا بھی نیوز رپورٹنگ کو ابھی بھی ایک مستند، قابل تصدیق اور بھروسہ مند ذریعہ بننے میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ اگر کوئی کسی دن دس اخبارات پر نظر ڈالے؛ خبروں کے دس مختلف بلیٹن دیکھے؛ دس مختلف ٹاک شوز سنے اور سوشل میڈیا کے اتنے ہی نیوز پلیٹ فارم پر جائے تو اسے ہر کہیں تقریباً ایک جیسا مواد ہی ملے گا لہجے اور پیکجنگ کی چند تبدیلیوں کے ساتھ۔ میرے خیال میں ذرائع ابلاغ میں خبروں کے ایک جیسے مواد کی وجہ اقتدار پر براجمان لوگوں کی کامیاب کوششیں ہیں جنہوں نے نیوز میڈیا کے منظرنامے سے، فرق، اختلاف، اور تنوع کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ البتہ، یہ سب کچھ خلا میں نہیں ہو رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ریاست کے نظریے اور سلامتی سے متعلق اس کے تحفظات کے تحت ہونے والی مصالحتوں اور ضروریات کی وجہ سے پاکستان کی لسانی و سیاسی تنوع، اور مذہبی و مسلکی تکثیریت کو دبانے کی اسی سے ملتی جلتی مہم کا نتیجہ ہے۔

ایک پروفیسر توہین رسالت کے الزام میں گذشتہ ساڑھے چھ برسوں سے جیل میں بند ہے۔ ایک اور پروفیسر کو ان کے شاگرد نے اس وجہ سے قتل کر دیا کہ اس شاگرد کو ان کے خیالات سے اختلاف تھا۔ طالبعلموں کو ایسی آراء کے اظہار پر بلوائی حملوں میں مار دیے گئے کہ اکثریت اُن آراء سے متفق نہیں تھی۔ کئی جگہوں پر طلبہ یونینوں پر پابندی عائد ہے طلبہ تنظیموں کو عمومی طور پر اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ جامعات کی انتظامیہ طالبعلموں کے اجتماعات اور کمرہ جماعت سے باہر کی سرگرمیوں کو محدود کر کے اور بعض اوقات طالبعلموں کی سوشل میڈیا کو پوسٹوں پر نظر رکھ کر ان کی سخت نگرانی کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

پاکستان کے نیوز میڈیا میں ایک ہی طرح کے مواد کی کی وجہ سے جس چیز سے ہم محروم ہوئے ہیں وہ مواد کی بہتات نہیں ہے بلکہ اس کی توانائی ہے اور میڈیا نے اور اور اسے عوام، جمہوریت اور شہری آزادیوں کے نقطہ نظر سے ریاستی بیانیے کی چھان بین کرنے اور اسے چیلنج کرنے کی استعداد بھی کھو دی ہے۔ موقع ملنے پر میں اس نیوز میڈیا کو ترجیح دوں گا جو کہ بعض اوقات لگتا ہو کہ اپنی حد سے باہر چلا گیا ہے نا کہ اس نیوز میڈیا کو جس نے اپنی روح ہی اپنے حملہ آور کے حوالے کر دی ہے جو کہ ریاست کے جابرانہ نظام کے علاوہ کوئی اور نہیں۔

تعلیمی اداروں میں سکڑتی ہوئی فضا

فیصل باری، لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (لمز) میں شعبہ معیشت و تعلیم کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔

" ایک پروفیسر توہین رسالت کے الزام میں گذشتہ ساڑھے چھ برسوں سے جیل میں بند ہے۔ ایک اور پروفیسر کو ان کے شاگرد نے اس وجہ سے قتل کر دیا کہ اس شاگرد کو ان کے خیالات سے اختلاف تھا۔ طالبعلموں کو ایسی آراء کے اظہار پر بلوائی حملوں میں مار دیے گئے کہ اکثریت اُن آراء سے متفق نہیں تھی۔ کئی جگہوں پر طلبہ یونینوں پر پابندی عائد ہے طلبہ تنظیموں کو عمومی طور پر اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ جامعات کی انتظامیہ طالبعلموں کے اجتماعات اور کمرہ جماعت سے باہر کی سرگرمیوں کو محدود کر کے اور بعض اوقات طالبعلموں کی سوشل میڈیا کو پوسٹوں پر نظر رکھ کر ان کی سخت نگرانی کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ایجنسیاں جامعات میں سیمینارز اور کانفرنسوں پر سخت نظر رکھتی ہیں اور بعض اوقات جامعات کو ایسی تقریبات منسوخ کرنے پر مجبور کرتی ہیں جس کے انعقاد کا اعلان ہو چکا ہوتا ہے۔

پاکستان میں اختلاف رائے کے لیے جگہ ہمیشہ سے تنگ رہی ہے۔ ہمیشہ سے اس کی راہ میں مشکلات حائل رہیں اور زیادہ تر یہ محدود ہی رہی ہے۔ مگر آج کے دور میں چیزیں کچھ مختلف ہیں۔ اول، اختلافی آوازوں کو دبانے/ یا بے توقیر کرنے کے طریقے زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ ثالثاً، دبانے کا عمل صرف ریاست ہی نہیں کر رہی بلکہ منظّم غیر ریاستی عناصر اور ان کے حامی بھی کر رہے ہیں۔ اور بعض واقعات اور معاملات میں ریاست اور انصاف کی فراہمی کے ادارے اُن گروہوں کے آگے بے بس ثابت ہوئے ہیں۔ تیسری بات، جسے مرکزی دھارا سمجھا جاتا ہے وہ دائیں طرف مڑ گیا ہے اور زیادہ تنگ بھی ہو گیا ہے۔ اور جو غالباً کبھی اختلاف نہیں سمجھا جاتا تھا اب اختلاف تصور ہوتا ہے۔ اور آخر میں، برسوں پر محیط جبر نے لوگوں میں سیلف سنسر شپ کے طریقوں کو متعارف کروا دیا ہے اور یہ جامعات کے اساتذہ پر بھی صادق آتا ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ دی نیوز آن سنڈے)

مسیحی آبادی کو اُن کے گرجا میں عبادت کی اجازت نہیں

ایچ آر سی پی کو معلوم ہوا کہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کے گاؤں نیو سرابہ، چک نمبر 336 میں ایک گرجا کو بند کر دیا گیا ہے۔ ایچ آر سی پی کو بتایا گیا کہ مقامی پولیس نے گاؤں کے مسلمانوں کے کہنے پر مقامی مسیحی برادری کو گاؤں میں ان کی واحد عبادت گاہ میں جانے سے روک دیا ہے۔

اس واقعے کی چھان بین کے لیے ایچ آر سی پی کے ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے 7 ستمبر کو ٹوبہ ٹیک سنگھ کا دورہ کیا اور وہاں مقامی مسیحی برادری کے نمائندوں، مسلم برادری کے لوگوں اور ضلعی انتظامیہ کے اہلکاروں سے ملاقات کی۔

مسیحی برادری کا بیان

مشن نے مسیحی برادری کے نمایاں رکن محترم رفاقت مسیح اور یونین کونسل کے رکن محترم جان مسیح ملاقات کی۔ رفاقت مسیح نے کوئی سات برس قبل اپنی برادری کے لیے گرجا تعمیر کرنے کی کوشش کی۔ رفاقت مسیح کے بقول، گاؤں میں لگ بھگ 400 گھرانے ہیں جن میں سے 40 سے 45 گھر مسیحیوں کے ہیں۔ مشن کو بتایا گیا کہ جس زمین پر گرجا تعمیر ہوا تھا وہ رفیق مسیح نامی شخص کی ملکیت تھی جو اس نے گرجا کے لیے وقف کر دی تھی۔ گرجا کی تعمیر کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم شروع کی گئی۔ مقامی مسیحی برادری نے اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ گرجا کی تعمیر کی تکمیل کے بعد اسے مذہبی عبادت کے لیے کھولا گیا اور مسیحی برادری کے لوگوں نے عبادت کے لیے گرجا آنا شروع کر دیا۔ گرجا 2011 سے 2016 تک فعال رہا جب پہلی مرتبہ مقامی مسلم برادری کے کچھ لوگوں نے اس عمارت کو عبادت کے لیے استعمال کرنے پر اعتراض کیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ عبادت کے دوران مسیحی برادری شور کرتی ہے اور یہ کہ عمارت کو شراب نوشی، گانے بجانے اور ناچنے جیسی غیر اخلاقی سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔

فیکٹ فائنڈنگ مشن کو بتایا گیا کہ عمارت کی تعمیر مکمل ہونے سے پہلے جب 2012 میں تعمیر کا کام جاری تھا تو مسلم برادری کے ایک مقامی فرد محترم عبدالرزاق نے سول عدالت میں دعویٰ دائر کیا کہ جس جگہ پر گرجا تعمیر ہو رہا ہے وہ اس کی ملکیت ہے۔ دعوے کے نتیجے کے بارے میں پوچھنے پر مشن کو بتایا گیا کہ دعویٰ خارج ہو گیا تھا۔ مشن سے ملاقات کرنے والے مسیحی برادری کے لوگوں کا کہنا تھا کہ تعمیری کام شروع ہونے کے فوری بعد، گاؤں کے کچھ مسلمانوں نے اُس علاقے میں گرجا کی تعمیر کے معاملے کا جائزہ لینے کے لیے ایک پنچایت (غیر رسمی عدالت) کا اہتمام کیا۔ فوری بعد، یونین کونسل کے چیئرمین کی سربراہی میں ایک اور پنچایت منعقد ہوئی۔ رفاقت مسیح سمیت مسیحی برادری کے کئی لوگوں ک پنچایت میں شرکت کرنے کے لیے کہا گیا جہاں انہوں نے گاؤں میں گرجا بنانے پر اعتراض کی وجہ پوچھی۔ اُن کے بقول، انہیں بتایا گیا کہ مقامی مسلمان اپنی آبادی میں گرجا کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ ان ساری مشکلات کے باوجود، گرجا تعمیر ہوا اور کئی سال عبادت کے لیے استعمال ہوتا رہا۔

فیکٹ فائنڈنگ مشن کی مقامی لوگوں سے ملاقات

2016 میں، گاؤں کے ایک مسلمان فرد محترم محمد صدیق نے پولیس کو ایک درخواست دی جس میں اس نے مسلم اکثریتی گاؤں میں گرجا کی موجودگی پر اعتراض کیا اور دعویٰ کیا کہ عبادت گاہ حکام کی اجازت کے بغیر تعمیر کی گئی ہے۔ محترم رفاقت مسیح سے اُس وقت کے اسٹیشن ہاؤس آفیسر (ایس ایچ او) عابد جٹ نے رابطہ کیا اور اُسے کہا وہ ضلعی انتظامیہ سے این او سی لیں کہ اسے اس گرجا کی تعمیر پر کوئی اعتراض نہیں۔ محترم مسیح نے این او سی کے لیے درخواست دی مگر انتظامیہ کا جواب تھا کہ وہ پہلے مقامی مسلمان برادری کے تحفظات دور کریں۔ اس کے بعد 2017 میں، مسلم برادری کے بعض لوگوں نے پھر پولیس سے رابطہ کیا اور اس سے گرجا کو بند کرنے کی درخواست کی۔ اس وقت کے ایس ایچ او ملک ناصر نے مسیحی برادری کو اس سے آگاہ کیا اور محترم رفاقت سمیت مسیحی برادری کے کچھ لوگوں کو 14 دسمبر کو پولیس اسٹیشن بلوایا جہاں ان سے ایک معاہدے پر دستخط کروائے گئے جس میں تحریر تھا کہ این او سی کے اجراء تک مسیحی گرجا کو عبادت کے مقاصد کے لیے استعمال نہیں کریں گے اور نہ ہی وہ گھروں میں عبادت کے لیے اکٹھے ہوں گے۔

مسیحی برادری نے ڈپٹی کمشنر (ڈی سی) ٹوبہ ٹیک سنگھ محترم عرفان نواز میمن سے این او سی جاری کرنے کی استدعا کی۔ انہیں گرجا کے بندوبست کے ذمہ دار ادارے فل گوسپل اسمبلی کی رجسٹریشن کی دستاویزات پیش کرنے کی ہدایت کی گئی۔ مسیحی برادری کے بقول، تمام مطلوبہ دستاویزات ڈی سی کو پیش کی گئیں۔ ڈی سی معاملہ اسسٹنٹ کمشنر (اے سی) محترم صادق مری کو بھیج دیا اس ہدایت کے ساتھ وہ اس کی چھان بین کریں اور ایک رپورٹ پیش کریں۔ اپنی رپورٹ میں اے سی نے لکھا کہ گرجا کی تعمیر غیر قانونی تھی اس لیے این او سی جاری نہیں ہونا چاہیے۔ اسی دوران، مقامی مسیحی برادری نے اپنے سیاسی رہنماؤں جیسے کہ محترم طاہر خلیل سندھو اور محترم کامران مائیکل سے رجوع کیا جنہوں نے ان کی کوئی مدد نہ کی۔

اے سی کی رپورٹ پیش ہونے کے بعد، ڈپٹی کمشنر نے ضلعی پولیس آفیسر (ڈی پی او) کو معاملے کی چھان بین کر کے ایک رپورٹ پیش کرنے کو کہا جو کہ ابھی تک پیش نہیں کی گئی۔ مسیحی برادری نے ریجنل پولیس آفیسر سے رجوع کیا جس نے ڈی پی او کو زبانی ہدایت کی کہ گرجا کھولنے کی اجازت دی جائے۔ اگلے دن ڈی پی او کا تبادلہ ہو گیا اور معاملہ ابھی تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔

محترم رفاقت مسیح کے بقول، اُس کے بعد سیکیورٹی انسپکٹر پولیس نے ڈی پی او کو بتایا کہ مقامی مسلمانوں کی مخالفت کی وجہ سے مسیحی گرجا نہیں چلا سکتے چاہے انہیں گرجا کھولنے کی سرکاری اجازت ہی کیوں نہ مل جائے۔ ان تمام پیش رفتوں کے بعد، مقامی مسیحیوں نے مقامی مسلمانوں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ گاؤں میں گرجا کے وجود کی مخالفت کرنا بند کریں مگر انہوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر پولیس اور مقامی مسلمان برادری نے انہیں گرجا کے لیے ایک متبادل جگہ کی پیش کش کی اور انہیں یہ بھی کہا گیا کہ انہیں گرجا کی تعمیر کے لیے دس لاکھ روپے بھی دیے جائیں گے۔ بعد میں گرجا کے لیے ایک اور جگہ دینے کی پیش کش ہوئی جو کہ ایک اسکول کے لیے وقف تھی۔ مسیحی برادری کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے دونوں پیشکشیں قبول کیں مگر ان میں سے کسی بھی عمل نہیں ہوا۔ اپنی تمام تر کوششوں کے باجود ریلیف نہ ملنے کی صورت میں انہوں نے گرجا کھلوانے کے لیے لاہور ہائی کورٹ میں ایک پٹیشن درج کی۔ عدالت نے اب تک صرف ایک سماعت کی ہے۔ معاملہ عدالت میں زیرالتواء ہے اور مسیحی برادری پرامید ہے کہ عدالت انہیں انصاف فراہم

کرے گی اور انتظامیہ کو ہدایت جاری گی کہ گرجا کی رجسٹریشن کا سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے۔ فیکٹ فائنڈنگ مشن کو معلوم ہوا کہ گاؤں کی مسیحی اور مسلم برادری اس ان معاملات پر جھگڑا بھی ہو چکا ہے جس میں ہوائی فائرنگ بھی ہوئی تھی۔ مسلم برادری مشن نے مسلم برادری کے کچھ لوگوں سے ملاقات کی جن میں محترم شمشاد احمد بھی شامل تھے۔ محترم احمد ان مسلمانوں میں شامل ہیں جو گرجا کی مخالفت میں پیش پیش ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مسیحی برادری کے کچھ لوگ بھی گاؤں میں گرجا کے وجود کے مخالف ہیں (مشن اس مشن کی اس دعوی کی آزادانہ تصدیق نہیں کروا سکا)۔ انہوں نے بتایا کہ معاملہ اس وقت شروع ہوا جب 2011 میں محترم رفاقت مسیح کی قیادت میں گاؤں کے کچھ مسیحوں نے گرجا کی تعمیر شروع کی۔ ان کے بقول، گرجا کی تعمیر سے پہلے یہاں ایک کچا مکان تھا جس میں تین لوگ رہتے تھے جن میں سے دو فوت ہو چکے ہیں جبکہ تیسرا فرد محترم رفیق مسیح اس مکان میں رہ رہا تھا۔ انہوں نے دعوی کیا کہ زمین محترم رفیق مسیح کی ملکیت تھی اور رفاقت مسیح نے اسے وہ زمین گرجا کے لیے عطیہ کرنے پر قائل کیا۔ جب گرجا کی تعمیر کا کام شروع ہوا تو مقامی مسلمان اس معاملے پر غور وخوض کرنے کے لیے گاؤں کی مسجد میں اکٹھا ہوئے۔ مقامی مسلمان برادری نے مسلم اکثریتی علاقے کے وسط میں گرجا کے وجود کی مخالفت کی اور کہا کہ اس سے ان کی چاردروچار دیواری متاثر ہوگی اور وہاں ہونے والی مذہبی سرگرمیاں علاقے کے مسلمانوں کے لیے باعث تکلیف ہوں گی۔

بعدازاں، مقامی لوگوں کا ایک اکٹھ ہوا جس میں محترم رفاقت مسیح کو پھر بلایا گیا اور گرجا کی تعمیر بند کرنے کا کہا گیا۔ محترم احمد کے بقول، محترم رفاقت مسیح نے اکٹھ کو بتایا کہ وہ کمیونٹی سنٹر تعمیر کر رہے ہیں مگر شمشاد احمد نے کہا کہ رفاقت کی یہ بات درست نہیں تھی کیونکہ عمارت کی تعمیر کا کام کرنے والی کاریگروں نے بتایا کہ عمارت کا ڈیزائن گرجا سے ملتا جلتا تھا جس سے مقامی مسلم برادری غصے میں آ گئی۔ اس کا مزید کہنا تھا کہ وہ محترم رفاقت مسیح سے ایک بار پھر ملے اور اور تعمیر کا کام ترک کو کہا مگر رفاقت نے تعمیر مکمل کی اور پھر گرجا کو عبادت کے لیے کھول دیا۔ محترم احمد نے الزام لگایا کہ مسیحی برادری نہ گرجا کو نہ صرف اپنی مذہبی سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا بلکہ انہوں نے اس کے گرد ونواح میں غیر اخلاقی سرگرمیاں شروع کر دیں جیسے کہ شراب نوشی، گانا بجانا اور رقص جس سے علاقے کی اکثریتی مسلم آبادی کو بہت تکلیف پہنچی۔

مسلم برادری نے مسیحی برادری کو گرجا میں عبادت سے روکنے کی کوشش کی جس کے بعد رفاقت مسیح نے مدد کے لیے پولیس سے رجوع کیا۔ اُدھر، مسلم برادری کے کچھ لوگوں نے بھی پولیس سے رجوع کیا اور گرجا بند کرنے کی اپیل کی۔ معاملے کی حساس نوعیت کو بھانپتے ہوئے مداخلت کی اور مسیحوں کو این او سی کے اجراء اور رجسٹریشن تک گرجا بند کرنے کی ہدایت کی۔ فیکٹ فائنڈنگ مشن کو بتایا گیا کہ مسلم آبادی کو اس معاملے پر لاہور ہائی کورٹ میں پٹیشن پر کسی پیش رفت کے بارے میں علم نہیں ہیاور کہا کہ انہوں نے سنا تھا کہ پٹیشن خارج ہوگئی تھی۔ محترم شمشاد احمد نے الزام لگایا کہ ایک بار کرسمس کے موقع پر کچھ مسیحوں نے ایک مسلمان دوکاندار کی دکان کے دروازوں کو دھکے دے کر اسے ہراساں کیا، نعرے لگائے اور ہوائی فائرنگ کی۔ محترم شمشاد احمد نے مشن کو بتایا کہ وہ مولوی عبداللہ اور مولوی خادم حسین سے رابطے میں ہیں جنہوں نے انہیں مدد کی یقین دہانی کروائی ہے اور یہ کہ اگر حکومت این او سی جاری کر بھی دے تو وہ گرجا میں عبادت نہیں کرنے دیں گے۔ شمشاد احمد کا کہنا تھا کہ مسیحی علاقے سے باہر، ترجیحاً کسی کھلے میدان میں جہاں مسلم آبادی نہ ہو، گرجا بنا سکتے ہیں۔

گرجا جس کے مذہبی استعمال پر پابندی عائد ہے

ٹوبہ ٹیک سنگھ کی ضلعی انتظامیہ

ایچ آر سی پی کے مشن نے ضلعی پولیس آفیسر (ڈی پی او) محترم وقار قریشی اور ڈپٹی کمشنر (ڈی سی) محترم میاں محسن رشید سے ملاقات کی جن کا کہنا تھا کہ انہیں اس معاملے کے متعلق کوئی علم نہیں۔ ڈی پی او نے دعوی کیا کہ اگر مسیحی برادری ان کے دفتر آتی ہے تو وہ معاملے کے حل کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ معاملہ عدالت میں زیر التواء ہے تو ڈی پی او اور ڈی سی دونوں نے کہا کہ وہ عدالتی فیصلے تک معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتے۔

مشاہدات:

- مسیحی برادری نے این او سی کے حصول کے لیے متعلقہ سرکاری حکام سے کئی بار رجوع کیا مگر ان تمام نے این او سی جاری کرنے سے گریز کیا اور معاملے کو طول دیتے رہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتظامیہ مقامی مسلم آبادی کے پرتشدد احتجاج کے خوف سے این او سی جاری کرنے اور گرجا کی رجسٹریشن کرنے سے گریزاں ہے۔
- مقامی پولیس اہلکاروں نے بعض مقامی مسلمانوں کے ساتھ ساز باز کر کے گرجا کی بندش کو یقینی بنایا جس سے مقامی مسیحی گاؤں میں اپنی واحد عبادت گاہ میں عبادت کرنے سے محروم ہوئے۔
- ایسے اشارے ملے ہیں کہ گرجا کی مخالفت میں پیش پیش چند مسلم افراد تحریک لبیک جیسی بنیاد پرست تنظیموں کے ساتھ رابطے میں ہیں جو کہ پریشانی کا سبب ہے۔
- موجودہ ڈی پی او اور ڈی سی کے بقول وہ اس معاملے کے بارے میں مکمل طور پر لاعلم تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے ضلع کی غیر مسلم آبادی کے مسائل سے لاتعلق اور غیر سنجیدہ ہیں۔
- معاملہ اس وقت عدالت میں زیر غور ہے اور درخواست گزار کے مطابق، عدالت نے متعلقہ ضلعی افسران سے رپورٹ طلب کی جو انہوں نے ابھی تک پیش نہیں کی ہیں جس سے معاملے کے عدالتی تصفیے میں غیر ضروری تاخیر ہو رہی ہے۔
- مقامی مسجد میں مسلمانوں کے اکٹھ اور اس معاملے پر بحث سے شبہ ہے کہ گرجا کو بند کروانے میں بعض مقامی مسلم مذہبی رہنماؤں کے کردار بھی ہو سکتا ہے۔
- پولیس نے مقامی مسیحی آبادی کو پاکستان کے آئین سے منافی معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا۔

سفارشات

- اعلیٰ حکام معاملے میں فوری مداخلت کریں، تمام متعلقہ فریقین سے رجوع کریں اور معاملے کو فی الفور حل کریں اس سے پہلے کہ اس معاملے کی وجہ سے گاؤں کی مسلم اور مسیحی برادری میں کوئی بڑا تصادم ہو جائے۔
- متعلقہ حکام کو یقینی بنانا چاہیے کہ مساجد مذہبی اقلیتوں کے خلاف اکٹھ کی جگہ کے مقصد کے لیے استعمال نہ ہوں۔
- ضلعی انتظامیہ، خاص طور پر پولیس کو متعصب مسلمانوں کی ناجائز مطالبات تسلیم کرنے کی پالیسی ترک کرنی چاہیے۔ انہیں ایسے افراد کو خوش کرنے کی پالیسی ترک کرنی چاہیے جو اپنے ہم وطن غیر مسلموں کو مذہبی آزادی دینے کے حق میں نہیں۔ حکام کو چاہیے کہ وہ مزید تاخیر کے بغیر عدالت میں حقائق پر مبنی رپورٹ پیش کریں تاکہ معاملے کا جلد از جلد تصفیہ ممکن ہو سکے۔

عزت مآب چیف جسٹس آف پاکستان سے اپیل برائے انصاف

محترم جناب چیف جسٹس آصف سعید کھوسہ صاحب

جناب عالی!

ملتان ہمارا بیٹا جنید حفیظ توہین رسالت کے جھوٹے مقدمے میں عرصہ چھ سال سے ملتان سنٹرل جیل کی کال کوٹھڑی میں قید تنہائی کی زندگی گزار رہا ہے۔ کئی ججوں کے ٹرانسفر، استغاثہ کے گواہوں کی تاخیری حربوں اور مقدمہ کی حساسیت کی بنا پر وکیل صفائی کے نہ ملنے کا نتیجہ ہے کہ ہمارا بیٹا ایک جھوٹے مقدمے میں انصاف کا منتظر ہے۔

مورخہ 3 ستمبر کو استغاثہ کے آخری گواہ پولیس کے تفتیشی افسر کی جرح کے بعد تقریباً تین مہینے میں بھی فیصلہ نہ ہو سکا۔ پراسیکیوشن نے یکے بعد دیگرے پانچ مختلف قسم کی بالکل لغو/ لایعنی درخواستیں محض اس لئے داخل کیں تا کہ مقدمے کا فیصلہ نہ ہو سکے۔ نتیجتاً ہمارا جوان بیٹا جو کہ پہلے ہی قید تنہائی اور عالم خوف میں زندگی بسر کر رہا ہے مزید ذہنی تناؤ کا شکار ہو رہا ہے۔ گزشتہ روز اس کے ساتھ ملاقات میں بوڑھے باپ اور جوان بیٹے کے آنسو تھے کہ تھم نہ پاتے تھے۔ جوان بیٹے کے دکھ سے نڈھال اس کی ماں اب بھی اس کی راہ تکتی ہے۔ جناب عالی ہم پر رحم کریں۔ ہمیں انصاف دلائیں۔ ہمیں اس عذاب سے نکالیں۔

العارض

روبینہ حفیظ

محمد حفیظ النصیر

والدین جنید حفیظ

26 نومبر، 2016

2 بچے زیادتی کا نشانہ بن گئے، ملزم گرفتار

ڈیرہ اسماعیل خان بچوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات میں اضافہ ہونے لگا، درندہ صفت بھیڑیا نما شخص نے دکان سے چیز خریدنے کے بہانے بچے کو اپنے ساتھ لے جا کر درندگی کا نشانہ بنا ڈالا، دوسرے واقعہ میں دس سالہ بچے کو زیادتی کا نشانہ بنا دیا گیا، پولیس نے الگ الگ مقدمات درج کر کے ایک ملزم کو گرفتار کر لیا، دوسرے کی گرفتاری کیلئے چھاپے جاری۔ ذرائع کے مطابق تھانہ پروآ میں بھٹہ خشت مزدور نے رپورٹ درج کرائی ہے کہ اس کی بیوی پانچ سالہ بیٹے کے ہمراہ شادی میں شرکت کیلئے قریبی پڑوس میں گئی ہوئی تھی، اس دوران اس کا بیٹا بچوں کے ساتھ باہر کھیل رہا تھا کہ نامعلوم ملزم اسے دکان سے چیز خریدنے کے بہانے اپنے ساتھ لے گیا اور قریبی فصل گنا میں لے جا کر بدفعلی کی، دوسرے واقعہ میں تھانہ چودھوان کی حدود موسیٰ زئی شریف میں ملزم نے دس سالہ بچے کو کوٹھہ اللہ داد کے قریب درختوں کے جھنڈ میں لے جا کر زیادتی کا نشانہ بنا دیا، ملزم کو گرفتار کر لیا گیا۔ (نامہ نگار)

پہلی جماعت کی طالبہ زیادتی کے بعد قتل

کرم ایجنسی 19 نومبر 2019ء کو پاراچنار کے سرحدی علاقے پیواڑ میں درندہ صفت قاتل نے پہلی جماعت کی طالبہ کو ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کر دیا، پولیس نے دو چوکیداروں کو گرفتار کر لیا، والدین کے قاتلوں کی فوری گرفتاری اور انہیں پھانسی پر لٹکانے کا مطالبہ کر دیا۔ ضلع کرم کے سرحدی علاقے پیواڑ غنڈی خیل سے تعلق رکھنے والے 60 سالہ قبائلی گل علی نے میڈیا کو بتایا کہ ان کی نواسی پانچ سالہ گل سکینہ گاؤں کے سرکاری سکول کی پہلی جماعت میں پڑھ رہی تھی، گزشتہ روز معمول کے مطابق جب سکول سے گھر واپس نہیں آئی تو ہم نے بچی کی تلاش شروع کر دی، کئی گھنٹے تلاش کے بعد بچی کی لاش پانی کے ایک چھوٹے تالاب سے برآمد ہوئی، بچی کی لاش ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال پاراچنار پہنچائی گئی جہاں پر میڈیکل رپورٹ سے معلوم ہوا کہ بچی کو زیادتی کا نشانہ بنایا گیا ہے، ڈاکٹروں کے مطابق بچی کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں ہے، بچی کے والد وارث علی فرنٹیئر کور میں لانس نائیک کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں، بچی کی والدہ کا انتقال چار سال پہلے ہوا، والدہ کے انتقال کے بعد دادی بچی کی پرورش کر رہی تھی، دلخراش واقعے کے بعد بچی کی دادی کومہ میں چلی گئی۔ بچی کے دادا گل علی اور عشرہ دار سردار علی نے مطالبہ کیا کہ اس واقعے کا مقامی انتظامیہ، پولیس اور اعلیٰ حکام فوری نوٹس لیں اور ملوث عناصر کو کیفر کردار تک پہنچائیں۔ دوسری جانب پولیس کے مطابق واقعے کے بعد سکول کے دو چوکیدار گرفتار کر لئے گئے ہیں، مزید تحقیقات جاری ہے۔ (روزنامہ آج)

عشرا// دھندھواں (smog)

خدا کے بجّن، انسانوں کے دشمن
شجر کُش، فیکٹری باز، آدمی خور
خوشی چور، جان لیوا، زندگی خور
جو طبقہ بستیوں پر حکمراں ہے
اب اس ظالم کے بس میں کچھ کہاں ہے
سوائے عیش! روز افزوں جو ہے دُھن!
مگر ہر ناتواں، کمزور کی خیر!
ہر اک دہلی، ہر اک لاہور کی خیر!
زمیں تک، آسماں پھیلا ہوا ہے
بہر سُو، دھندھواں پھیلا ہوا ہے

ادریس بابر

☆☆☆

اشرا// صلاح الدین ایوبی آف گجرانوالہ دی وَیل

جب ہم موقع واردات پر پہنچے
وہ اپنی ٹانگیں توڑ کے بھاگ رہا تھا
عینی شاہدوں کے دیکھتے ہی دیکھتے
اس نے اپنی دونوں آنکھیں پھوڑ لیں
ٹول ٹول کر اپنی دسیوں انگلیاں توڑیں
ناخن کھینچنا پھر کوئی مشکل نہیں رہا تھا
اسے کئی بار تحریری وارننگ دی گئی
ہماری سگرٹوں سے جسم مس نہ کرے
ٹوٹا ہوا بازو جھلا کر اس نے پستول چھینا
اور اپنے پھٹے ہوئے سر پر رکھ کر لبلبی دبا دی

غیرت کے نام پر 2 خواتین اور ایک مرد قتل

پشاور 3 نومبر 2019ء کو بڈھ بیر پولیس سٹیشن کے علاقے ماشوگر میں غیرت کے نام پر دو خواتین سمیت تین افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، مدعی رحمین خان ولد موسیٰ خان سکنہ تیرہ اور کزئی حال قاضی آباد نے پولی سکے پاس رپورٹ درج کراتے ہوئے بتایا کہ اس کے بھتیجے محمد سعود ولد خیوا خان سکنہ شاد کلے تیراہ اور کزئی، اس کی 18 سالہ بیٹی یاسمین بی بی اور 20 سالہ بھتیجی رقیہ بی بی دختر خیال بت خان کو ملزمان میاں دین اور واقف خان پسران جلات خان نے گھر کے اندر گھس کر فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا، اس نے پولیس کو بتایا کہ دو جوان لڑکیاں اور اسکا 25 سالہ بھتیجا سعود اور اس کی بہو اور بیٹا کل پانچ لوگ رات کو ایک کمرے میں سوئے ہوئے تھے اور وہ خود بیوی کے ساتھ دوسرے کمرے میں تھا، پولیس نے اس کیس میں رپورٹ لیکر مقدمہ درج کرلیا، تاہم رحمین کی حرکات وسکنات مشکوک تھیں اور اسے خاص کر مرد کی لاش کو دفنانے کی بہت جلدی تھی، گھر کرایہ پر حاصل کیا گیا تھا اور اس میں صرف دو ہی کمرے تھے، رحمین کے مطابق سعود لاوارث تھا پولیس نے اس خاندان کی نگرانی کرنے کا فیصلہ کرلیا اور جلد ہی مخبروں نے اطلاع دی کہ رحمین غلط بول رہا ہے۔ پولیس کو اس کیس میں اصل کامیابی تب ملی جب مقتول سعود ولد خیواہ ان جسے مدعی نے لاوارث قرار دیا تھا، اس کی بیوی اسلام آباد سے اپنے شوہر کی موت کا سن کر پہنچ گئی اس نے مقامی افراد کو بتایا اور وہ اسے لیکر پولیس کے پاس آگئے، مقامی افراد کے مطابق خاتون نے ان کو بتایا کہ اس کے شوہر کو رحمین کسی بہانے سے پشاور لایا تھا اور اس کا شوہر اور یاسمین ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، مسماۃ یاسمین کی منگنی ہوچکی تھی لیکن اس نے اس شادی سے انکار کردیا تھا اور اس کا اصرار تھا کہ وہ سعود سے شادی کرے گی، اسی لئے رحمین اور اس کا بیٹا اسے کسی بہانے سے پشاور لے آئے اور اسے رات کو مسماۃ یاسمین کے ساتھ ایک کمرے میں سلا کر قتل کردیا، تیسری لڑکی مسماۃ رقیہ بی بی ان کی کزن اور رحمین کے بھائی کی بیٹی تھی اور اس کی منگنی بھی ہوچکی تھی لیکن وہ بھی والدین کی پسند کی جگہ پر شادی کرنے سے انکاری تھی اور اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتی تھی اسی لئے انہوں نے اسے بھی بلالیا تھا اور تینوں کو رحمین کے بیٹے نے فائرنگ کر کے قتل کرنے کے بعد پولیس کے پاس جا کر اپنے مخالفین کے خلاف مقدمہ درج کرلیا۔

(نامہ نگار)

دو بیویوں کو قتل کردیا

ژوب 8 نومبر کو روز ژوب کے علاقے بوبی نرگسئی میں عبدالغفار نے گھریلو ناچاقی پر فائرنگ کر کے اپنی دو بیویوں کو قتل کردیا۔ اور موقع سے فرار ہوگیا۔ پولیس موقع پر پہنچ کر لاش کو تحویل میں لے کر ملزم عبدالغفار کے خلاف ایف آئی آر درج کرلی۔ ملزم نے دو شادیاں کر رکھی تھیں اور مذکورہ دن ان سے تلخ کلامی کے نتیجے میں ان پر فائرنگ کردی جس کے باعث ان کی موت واقع ہوگئی۔

(نامہ نگار)

تین لاشیں برآمد

تربت 10 نومبر کو بلیدہ علاقے گروانگ سے تین لاشیں برآمد جن کو گولیاں مار کر قتل کیا گیا تھا۔ بلیدہ انتظامیہ کو اطلاع ملی کہ میدانی علاقے میں تین لاشیں پڑی ہیں۔ بلیدہ لیویز نے موقع پر پہنچ کر لاشیں قبضہ میں لیں اور ان کو ہسپتال منتقل کیا۔ جن کو گولیاں مار کر قتل کیا گیا ہے۔ بعد میں جن کی شناخت بلیدہ کے رہائشی نعمت ولد عبدالکریم۔ صلاح الدین ولد عنایت اللہ سکنہ خدابادان پنجگور اور زبیر ولد بدل خان سکنہ خاران کے نام سے ہوئی۔ (روزنامہ انتخاب کوئٹہ)

سکینہ کے قاتلوں کو سزا دی جائے

پشاور 22 نومبر 2019ء کو سول سوسائٹی کے زیر اہتمام پشاور پریس کلب کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کیا گیا، جس میں پارہ چنار میں پانچ سالہ سکینہ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی انکوائری اور قاتلوں کو فی الفور سزا دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ احتجاج میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے شرکی کی، شرکاء سے خطاب کے دوران طلباء تنظیم کے سربراہ ذیشان، سماجی کارکن جمیلہ گیلانی، تیمور کمال، سلام مندوخیل، مشتاق درانی اور نظیف ہشتغر نے مشترکہ خطاب کے دوران کہا کہ صوبے میں بچوں کے ساتھ جنسی زیادتیوں کے بعد قتل ہونے کے واقعات میں روز بروز اضافہ تشویشناک ہے۔ حکومت اس ضمن میں بچوں کے ساتھ اس قسم کے واقعات کی روک تھام کے حوالے سے موثر قانون سازی کرے، تاکہ نہ صرف ان واقعات کی روک تھام ہوسکے بلکہ والدین کو بھی اس خوف سے آزاد کیا جاسکے۔ شرکاء نے واقعات میں پولیس کے کردار کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔

(نامہ نگار)

تنخواہوں کی عدم ادائیگی، مزدوروں کا احتجاج

پشاور 15 نومبر 2019ء کو پشاور بس ریپڈ ٹرانزٹ منصوبے کے مزدوروں کا تنخواہیں کی عدم ادائیگی پر احتجاج۔ حیات آباد چوک بلاک کردیا، انتظامیہ کے خلاف شدید نعرہ بازی، بی آر ٹی میں کام کرنے والے مزدوروں نے حیات آباد میں بشارت روڈ بند کردیا۔ بی آر ٹی منصوبے پر کام کرنے والے مزدوروں نے گزشتہ روز کئی ماہ سے تنخواہوں کی بندش کے خلاف گزشتہ روز بشارت روڈ پر احتجاج کیا ور کام بند کر کے روڈ کو بلاک کردیا، مظاہرے میں ویلڈنگ، سیفٹی، سکیورٹی اور ڈرائیور شامل تھے، مزدوروں کے احتجاج کے باعث ٹریفک کا نظام درہم برہم ہوکر رہ گیا، مظاہرین کا کہنا تھا کہ چار ماہ سے تنخواہیں نہیں ملی، فاقہ کشی پر مجبور ہیں، حکام چار ماہ سے تنخواہیں دینے میں ٹال مٹول کررہے ہیں ان کا کہنا تھا کہ پانچ سو سے زائد مزدوروں کو تنخواہیں نہیں دی گئی ہیں، جب تک چار ماہ کی تنخواہ نہیں ملتی کام شروع نہیں کرینگے۔

(روزنامہ آج)

مسیحی برادری کا مخصوص قبرستان کیلئے مظاہرہ

سوات 24 نومبر 2019ء کو سوات میں مسیحی برادری نے اپنا مخصوص قبرستان نہ ہونے کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا۔ مسیحی برادری کے افراد نے مکان باغ میں چرچ کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کیا جس سے اقلیتی ایم پی اے وزیرزادہ اور دیگر مقررین نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم سوات میں پیدا ہوئے ہیں۔ سوات کے رہائشی ہیں لیکن سوات میں مسیحی برادری کیلئے قبرستان نہ ہونے کی وجہ سے ہم انتقال کرنے والے مسیحوں کو دفنانے کیلئے ملاکنڈ، پشاور یا دوسرے علاقوں میں لے کر جاتے ہیں، اکثر اوقات اس کا خرچہ برداشت نہیں کرسکتے۔ انہوں نے کہا کہ ہم پاکستانی ہیں اور پاکستان کے آئین میں اقلیتوں کو خصوصی حقوق حاصل ہیں، اس لئے حکومت سوات میں مسیحی برادری کیلئے قبرستان کا انتظام کرے، تاکہ جہاں ہم پیدا ہوئے ہیں، وہاں ہم کو سپرد خاک بھی کیا جائے۔

(روزنامہ مشرق)

انسانی حقوق کے عالمی دن

دسمبر

یکم دسمبر	ایڈز کا عالمی دن
2 دسمبر	غلامی کے خاتمے کا عالمی دن
3 دسمبر	معذور افراد کا عالمی دن
5 دسمبر	معاشی اور سماجی ترقی کے لیے رضا کاروں کا عالمی دن
5 دسمبر	زرعی زمین کا عالمی دن
7 دسمبر	شہری ہوابازی کا عالمی دن
9 دسمبر	بدعنوانی کے انسداد کا عالمی دن
10 دسمبر	انسانی حقوق کا عالمی دن
11 دسمبر	پہاڑوں کا عالمی دن
18 دسمبر	تارکین وطن کا عالمی دن
20 دسمبر	انسانی یکجہتی کا عالمی دن

12 نومبر 2019، لاہور:
ایچ آر سی پی نے پاکستان میں
ایذا رسانی کے خلاف قانون سازی
اور یو این کیٹ پر عملدرآمد پر
ورکشاپ کا انعقاد کیا

08 نومبر 2019، اسلام آباد:
ایچ آر سی پی نے پاکستان میں اقوام متحدہ
کے ایذا رسانی کے خلاف معاہدے پر
عملدرآمد پر ایک قومی مشاورت کا انعقاد کیا

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
''ایوان جمہور'' 107۔ ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
فون : 35838341-35864994 فیکس : 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ : www.hrcp-web.org
پرنٹر : مکتبہ جدید پریس، 14 ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15